دیوانِ مؤمن خان مؤمنؔ پر 4 مقدمے

پہلا مقدمہ از عبد الودود خان

دوسرا مقدمہ از ڈاکٹر سید عبد اللہ

تیسرا مقدمہ از ظہیر احمد صدیقی

چوتھا مقدمہ از ظفر احمد صدیقی

مرتب: غلام مصطفیٰ دائمؔ اعوان

مرتبہ

عبدالودود خاں

پبلشرز

سنگم کتاب گھر دہلی

(جناب مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

شعرائے اُردو میں مومن دہلوی کو کئی اعتبارات سے جو امتیازی درجہ حاصل ہے وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ان کی ذات میں کئی ایسے اوصاف جمع ہو گئے ہیں جو فرداً فرداً بھی دوسروں کے ہاں مشکل سے ملیں گے اور مجموعی طور پر تو کوئی ایسی شخصیت خیال میں نہیں جو ان اوصاف میں ان کی شریک ہو۔

(۱) وہ نہ صرف اُردو کے صاحب طرز اُستاد ہیں بلکہ فارسی شعر و انشار میں بھی اپنے عہد کے منتخب افراد میں ہیں ان کی اُردو شاعری پر حال میں کافی لکھا گیا ہے لیکن فارسی کلام پر جو ۱۲۷۱ھ میں ان کے عزیز حکیم احسن اللہ خاں کے اہتمام سے مطبع سلطانی قلعہ دہلی میں طبع ہوا تھا چنداں توجہ نہیں کی گئی حالانکہ وہ اس کا مستحق تھا۔

(۲) انھوں نے مرزا غالب اور ذوق کے برخلاف صرف ایک دو صنف شعر ہی کو نہیں لیا بلکہ تمام اصناف سخن کو برتا اور کامیابی کے ساتھ برتا۔ اردو کیا فارسی میں بھی معدودے چند ایسے اساتذہ ملیں گے جو ایک سے زیادہ صنف پر قادر ہوں اس کے برعکس مومن کا کمیت قلم غزل۔ قصیدہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ قطعہ۔ نیز حمد۔ نعت۔ منقبت۔ مدح۔ مرثیہ وغیرہ کی دشوار گذار راہوں کو کامیابی کے ساتھ طے کرتا چلا جاتا ہے۔

(۳) مومن مختلف علوم و فنون کے جامع تھے اور جامعیت کے ساتھ کمال یہ تھا کہ جس علم یا فن کو اختیار کیا اس میں دستگاہ کامل بہم پہونچائی۔ علوم دینی کے علاوہ طب۔ ریاضی ہیئت۔ رمل۔ شطرنج۔ موسیقی میں بھی وہ اس وقت کی دہلی میں کامل روزگار مانے جاتے تھے۔

(۴) وہ اپنے عہد کی مذہبی و سیاسی تحریکات سے پوری ہمدردی رکھتے تھے اور ان کو کامیاب بنانے کیلئے ہمیشہ ساعی رہتے تھے۔ اسکی جھلک ان کی شاعری میں بھی ملتی ہے۔ اور اسکے

مطالعہ کے بغیر ان کی شاعری پر رائے قائم کرنا درست نہیں۔

(۵) ان کی شاعری روایتی نہیں ہے بلکہ آپ بیتی ہے اس لحاظ سے ان کا کلام تمام تر صدق جذبات کا آئینہ دار ہے۔

(۶) وہ طبعاً روش عام پر چلنا پسند نہ کرتے تھے اس وصف نے ان کو خیال اور بیان کی نئی نئی راہیں دکھائیں، اور اسی وجہ سے ان کی شاعری میں پیچیدگی اور اشکال پیدا ہوگیا۔ اور اسی کی بدولت ان کے ہاں دوسرے اساتذہ سے اخذ توارد کی مثالیں نہیں ملتیں۔

(۷) انھوں نے کبھی شاعری یا دوسرے کمالات کو پیشہ بنانا گوارا نہ کیا نہ اہل دول کی مدح کی۔

یہ افسوس کا مقام ہے کہ ان خوبیوں کے باوجود مومن کے کلام پر جیسی کہ چاہیئے توجہ نہیں کی گئی۔ مومن نے سچ کہا تھا ؎

"یوسفم را بہ کلاوۂ پیرزال نمی فروشند — واز چاہ کنعانی بہ سیم قلب ہم نمی برند"

خودستائی نہیں بلکہ اظہار حقیقت مقصود ہے کہ پہلی بار ان کے کلام کی تصحیح اور تشریح کا خیال راقم الحروف کو آیا۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء میں میری مرتبہ شرح قصائد مومن الناظر پریس لکھنؤ سے اور ۱۹۳۴ء میں شرح غزلیات شانتی پریس الہ آباد سے اشاعت پذیر ہوئی[۱]۔ اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ یہ ایڈیشن عام بازاری نسخوں سے صحیح تر ہو اسی کے ساتھ شروع میں مفصل مقدمہ اور حواشی ذیل میں مشکل اشعار کے مطالب دیدیئے گئے ہیں۔ راقم نے شرح غزلیات کے پہلے ایڈیشن (۱۹۳۵ء) میں اپنا خیال ظاہر کیا تھا۔ "الحمد للہ کہ ملک کے مطلع پر جمود کی جو گھٹا چھائی ہوئی تھی اب بتدریج چھٹتی جارہی ہے اور امید کی شعاع اپنا چمکتا چہرہ دکھا رہی ہے۔"
شکر ہے کہ یہ خیال بے بنیاد ثابت نہیں ہوا اور ملک کے اہل قلم مومن کے ساتھ انصاف

---

[۱] اس کا دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن ۱۹۴۷ء میں اور تیسرا کسی قدر اضافہ و ترمیم کیساتھ ۱۹۵۶ء میں چھپ گیا ہے۔

کرنے پر مائل ہوئے چنانچہ ۱۹۲۸ء میں رسالہ اُردو میں خاکسار کے مقالے کے ساتھ پہلی دفعہ مومن کی تصویر شائع ہوئی اور ۱۹۲۸ء میں نگار نے اپنا مومن نمبر بڑے اہتمام سے نکالا۔ اس کے بعد متعدد لکھنے والوں نے موقر رسائل میں مومن پر مقالات و مضامین لکھے۔ آج کل بھی ایک انتخاب مومن شرح کے ساتھ انجمن ترقی اردو علی گڑھ کی نگرانی میں چھپ رہا ہے۔

اس کے علاوہ جہاں تک معلوم ہوا ہے تقریباً چھ سات افراد یا ادارے ہندوستان یا پاکستان[۲] میں کل کلام یا انتخاب پر کوئی نہ کوئی کام کر رہے ہیں جس کو یقیناً ایک فال نیک کہا جا سکتا ہے۔

حال میں عبدالودود صاحب (دہلی) نے ایک انتخاب مومن تیار کیا ہے جس میں قصائد غزلیات۔ مثنویات۔ اور دوسری اصناف سے اشعار لئے گئے ہیں۔ راقم کو غزلیات کے سوا دوسری اصناف کا انتخاب دیکھنے کا موقع نہیں ملا اور غزلیات کو بھی قلت فرصت کے باعث جستہ جستہ پڑھ سکا۔ انتخاب کی نوعیت کے بارے میں یہ عرض کرنا کافی ہے کہ ہر شخص کا مذاق جُدا ہے اور ضروری نہیں کہ ایک شخص کا انتخاب دوسروں کے ذوق کی بھی لازمی طور پر تسکین کرے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ انھوں نے ایک ادبی خدمت انجام دی ہے اور ضرورت ہے کہ ملک کے ادبی حلقے ان کی ہمت افزائی کریں۔

ضیاء احمد بدایونی
ریڈر مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

۱۲ر نومبر ۱۹۵۷ء

---

[۲] حال میں پاکستان سے کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی منظر عام پر آیا ہے جو افسوس ہے کہ سرتاپا غلط اور مسخ شدہ ہے اور جس میں بازاری مطبوعہ نسخوں کی بجنسہ نقل کر دی گئی ہے امید ہے کہ عبدالودود صاحب ایسے نسخوں کی جگہ کسی صحیح نسخے کو اپنا ماخذ قرار دیں گے۔

مقدمہ

حکیم نامدار خاں اور حکیم کامدار خاں دو بھائی تھے جو کشمیری شرفا سے متعلق تھے سلطنت مغلیہ کا شیرازہ ابھی بکھرا تو نہ تھا مگر انتشار کے آثار ضرور پیدا ہو چکے تھے۔ کہ یہ دونو بھائی شاہی طبیب بن کر شاہ عالم کے دربار میں داخل ہوئے اور موضع بلاہہ اور نارنول میں جاگیر پائی۔
نامدار خاں کے بیٹے حکیم غلام نبی خاں کوچہ چیلان میں رہتے تھے جس کو پرانے وقتوں میں کوچہ چہل امیران یا کوچہ چہلان کہا جاتا تھا۔ سنتے ہیں کہ یہاں چالیس درباری رئیس رہتے تھے اور اسی وجہ سے اس محلہ کا یہ نام پڑا تھا۔ محلہ آج بھی قائم ہے اگرچہ اس کی شکل وصورت زمانے نے بدل دی ہے اور پرانے مکینوں کو اجل چھین کر لے گئی ہے پھر بھی کچھ پرانے آثار باقی ہیں جن میں حکیم غلام نبی خانصاحب کا مکان بھی ہے۔ دِلّی والوں نے بیرسٹر آصف علی کا مکان تو دیکھا ہوگا (جسمیں آجکل لڑکیوں کا اسکول ہے) اس مکان کی پشت پر مغرب میں ایک پتلی سی گلی ہے۔ اس گلی میں حکیم صاحب کی حویلی تھی جو اب بھی کسی نہ کسی شکل میں باقی ہے۔ تو اس حویلی میں حکیم صاحب کے ہاں ایک بیٹا ہوا یعنی حکیم نامدار خاں کا پوتا۔ سن ولادت ۱۲۱۵ھ ہے۔
غلام نبی خاں کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سے بڑی عقیدت تھی۔ شاہ صاحب بڑے پائے کے بزرگ گزرے ہیں اور بڑے جیّد محدث مانے جاتے ہیں۔ ان کا مدرسہ حکیم صاحب کے

گھر کے قریب ہی یعنی کلاں محل میں تھا۔ عمارت آج بھی باقی ہے مگر اب نہ پڑھنے والے ہیں نہ پڑھانے والے۔ انہی شاہ صاحب نے لڑکے کے کان میں اذان کہی اور مومن خاں نام رکھا۔ گھر والوں کو یہ نام کچھ پھیکا سا لگا اور چاہا کہ حبیب اللہ کہکر پکاریں مگر اللہ والوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے ان کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔ بھلا شاہ صاحب کا رکھا ہوا نام کیسے بدل جاتا۔ مومن مومن ہی رہے اور دنیا نے انھیں مومن ہی پکارا۔

بچپن کی ابتدائی شد بود کے بعد حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ سے عربی کی تحصیل کی طبیعت میں تیزی تھی اور ذہن بہت رسا پایا تھا۔ حافظہ بھی بڑے غضب کا تھا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ کا وعظ سن کر ہو بہو اسی طرح ادا کر دیا کرتے تھے۔ عربی پڑھ لینے کے بعد اپنے آبائی پیشے یعنی طب کی طرف متوجہ ہوئے اور اپنے چچا حکیم غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں کی شاگردی اختیار کی۔ چچاؤں نے بڑی محبت سے پڑھایا اور تجربہ حاصل کرانے کیلئے اپنے ہی مطب میں نسخہ نویسی کرائی پھر طبیعت نجوم کی طرف مائل ہوئی چنانچہ جب اس طرف قدم بڑھایا تو دلی کے واحد نجومی گنے جانے لگے۔ ان کے اکثر احکام ایسے ٹھیک ٹھیک پورے اترتے تھے کہ اچھے اچھے نجومی حیران رہ جاتے تھے۔ حافظے کا یہ عالم کہ بس سال بھر میں ایک دفعہ تقویم پر نظر ڈال لی بس کافی ہے۔ اب بار بار نہ زائچہ کھینچنے کی ضرورت ہے نہ تقویم دیکھنے کی۔ سیاروں کی رفتار پوری طرح ذہن میں ہے جو چاہے سوال کرلے۔

شطرنج سے امراء کو ہمیشہ دلچسپی رہی ہے۔ مومن بھی اس کے بڑے شائق تھے دلی میں صرف مولانا فضل حق ہی مومن کا مقابلہ کر سکتے تھے مگر وہ بھی عموماً ہارا کرتے تھے آیئے ان کے نجوم کا ایک واقعہ نقل کر دوں جو دلی کے آخری مشاعرے "سے لیا ہے۔ ایک شاہ زادے مومن کے پاس شطرنج کا ایک نقشہ پوچھنے آئے تو دیوار پر ایک چھپکلی بیٹھی ہوئی تھی۔ مومن نے کہا

میاں صاحبزادے جب پچھم سے ایک دوسری چھپکلی آکر اس چھپکلی کو اپنے ساتھ لیجائے گی تو نقشہ بتایا جائے گا۔ جس دیوار پر چھپکلی تھی اسکے پچھم رخ یہ سب لوگ بیٹھے تھے اور ان لوگوں کے بعد دروازہ تھا تو چھپکلی کا آنا اور اتنے آدمیوں کے درمیان سے ہو کر جانا مشکل تھا کہ ناگہاں ایک کپڑے والا آیا اس نے جو اپنی گٹھری زمین پر ڈالی۔ اس میں سے ایک چھپکلی نکلی اور دیوار پر چڑھ کر پہلی چھپکلی کے پاس گئی پہلی چھپکلی اس دوسری چھپکلی کے ساتھ چھت پر غائب ہو گئی۔

مومن نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ بقول مولانا حالی کے دورِ اکبریؒ شاہجہانی کی دِلّی کی یاد دلاتا تھا۔ مومن کا گھرانہ ایک مذہبی گھرانا تھا اور ان کی پرورش بھی ایک مذہبی ماحول میں ہوئی اس وجہ سے مومن خدا ترس اور خدا پرست رہے۔ مومن نے بحیثیت شاعر کے ایک نئی راہ شاعری میں پیدا کی اور لوگوں کی طرح مومن لکیر کے فقیر نہیں رہے۔ ان سے پہلے لوگوں میں سے کسی نے چمن ادب کے پھولوں سے پیار کیا ہے کسی نے کانٹوں سے دامن تار تار کیا ہے۔ مگر مومن نے صرف گلوں کو ہی نہیں چوما صرف خاروں سے ہی دامن نہیں اُلجھایا بلکہ چمن کی ہر پتی کو نگاہِ التفات سے دیکھا ہے۔ چمن کے ذرّے ذرّے سے پیار کیا ہے۔ خس و خاشاک کو چوما ہے۔ مومن نے وہ راہ نکالی ہے جس میں نہ صرف گل ہی گل ہیں نہ خار ہی خار بلکہ ان کے درمیان سے ایک راستہ نکالا ہے۔ مومن نے زلف برہم کو سنورنا ہی نہیں سکھایا بلکہ سنوری ہوئی زلفوں کو بکھرنا بھی سکھایا ہے۔ جہاں آسمانِ ادب پر ذوق و غالب جیسے کہکشاں و ثریا موجود ہیں وہاں مومن نے اپنے لئے قطبی ستارہ کا سا اٹل مقام تلاش کیا ہے۔ مومن کا اسپ تیزگام شاعری اور ادب کی شاہراہوں پہ بے محابہ دوڑا ہے اور خوب دوڑا ہے۔ اگر گلاب مختلف رنگوں کے ہوں تو ان کے پیلے سفید۔ گلابی اور سُرخ ہونے سے نسل پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے اور وہ سب کہلاتے گلاب ہی ہیں اسی طرح مومن کی غزل ہے۔ مومن وارداتِ عشق فراق و

وصل، خزاں و بہار، یاس و اُمید سب کو بیان کرتے ہیں لیکن جس طرح مختلف رنگوں کے گلابوں کا مرکز ایک ہے اسی طرح غزلِ مومن کا مرکز بھی ایک ہے اور وہ مرکز سے نہیں ہٹتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ اس درجہ پر پہنچ گئے ہیں جہاں ان کے ہم عصروں میں سے کوئی بھی نظر نہیں آتا ہے۔ مومن کی غزل کی بنیاد صرف وارداتِ عشق پر ہے۔ جو بنیادِ غزل ہے۔ مومن کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اس تنگ میدان میں وسعت پیدا کی ہے اور اس محدود صنف میں وہ کمالات پیدا کئے ہیں کہ نفس غزل کے لحاظ سے بہترین غزلگو کہلانے کے مستحق ہیں اور کیونکہ مومن کی تمام تر شاعری صرف غزل ہی نہیں بلکہ قصائد مثنویات اور رباعیات تمام تر داخلی ہے ثبوت میں مومن کا شعر پیش ہے ؎

شبِ ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

مومن کی غزلگوئی کا اعتراف خود غالب نے مومن کے ایک شعر ؎

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

پر اپنا پورا دیوان نثار کر دینے کو کہہ کر کیا ہے۔ نازک خیالی اور مضمون آفرینی جس کو فارسی شعراً کے یہاں کافی عروج حاصل ہے۔ اردو میں یہ وصف سب سے پہلے مومن نے اپنی غزل میں پیدا کیا یہاں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مومن اس طرز کے موجد ہیں گو کہ غالب بھی اس فن میں شریکِ مومن ہیں مگر خود مولانا الطاف حسین حالی نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ نازک خیالی غالب سے زیادہ مومن میں ہے۔ اور یہ ٹھیک بھی ہے کہ غالب نے اسکو اس حد تک نہیں اپنایا جس حد تک کہ مومن نے جیسے ؎

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

معشوق کے نہ دیکھنے کو کس انداز سے نگاہ التفات ثابت کیا ہے۔ یا پھر ایک جگہ کہتے ہیں ؎

تھا مقدر میں اس سے ملنا کم کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی

مومن اس فن کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی مومن اپنے مطلب کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ مخاطب یا محبوب یہ سمجھے کہ جو کہا جا رہا ہے اسمیں اسی کا فائدہ ہے جیسے ؎

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

معاملہ بندی :۔ اس فن میں مومن سے پہلے جرات نے بھی طبع آزمائی کی ہے مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ کیونکہ جرات اس جگہ ذرا ادب سے نیچے بھی گر گئے ہیں لیکن مومن نے دایرۂ تہذیب میں رہ کر جذبات عشق کی ترجمانی کی ہے جیسے ؎

ہر چند اضطراب میں میں نے کمی نہ کی — تو بھی نہ واں تغافل بسیار کم ہوا

یا ؎ وصل کی شب شام سے میں سو گیا — جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

طنز :۔ تاریخ ادب سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس فن کو مومن سے زیادہ کسی نے نہیں اپنایا غالب نے کہا ہے ؎

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے — ہوئے تم دوست جسکے دشمن اسکا آسماں کیوں ہو

غالب کا کہنا ہے کہ محبوب کی دوستی کے بعد آسمان کی دشمنی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور مومن فرماتے ہیں ؎

رحم فلک اور مرے حال پر — تو نے کرم اے ستم آرا کیا

یعنی محبوب کے ظلم اس قدر بڑھے کہ آسمان کو رحم آنے لگا۔ گویا بقول غالب محبوب کی محبت میں مبتلا ہونے پر آسمان جو مصیبتوں کا ذمہ دار ہے ایک عاشق پر مصیبتیں نازل نہیں کرتا بلکہ اس محبت کو ہی ایک بڑی مصیبت سمجھ کر پھر عاشق کو چھوڑ دیتا ہے اور بقول مومن محبوب سے محبت ہونے پر نہ صرف یہ کہ آسمان دشمنی چھوڑ دیتا ہے بلکہ اس کو عاشق پر رحم آنے لگتا ہے۔ غرضیکہ اس قسم کے طنز اور چٹکیاں مومن کے کلام میں بہ افراط ہیں۔ اس کے علاوہ مومن جلی کٹی سنانے میں بھی اور شاعروں کیطرح واسوخت کے میدان میں بھی دوسروں سے پیچھے نہیں رہے ہیں مثلاً ؎

کیا نامہ میں لکھوں دلِ وابستہ کا احوال — معلوم ہے پہلے ہی کہ وہ وا نہ کریں گے
ٹھہری ہے کہ ٹھہرائیں گے زنجیر سے دل کو — پر پھر بھی زلف کا سودا نہ کریں گے
گر آرزوئے وصل صنم نے بیمار کیا تو — پرہیز کریں گے پہ مداوا نہ کریں گے

مومن خاں شاعر ہونے کے ساتھ ایک پکے دیندار انسان بھی ہیں کیونکہ پکے دیندار ہیں اس وجہ سے دیندار بھی ہیں اور بلند اخلاق بھی اسی وجہ سے مومن کا عشق اور کلام بازاری نہیں ہے۔ وہ دادِ عیش دینے میں بیباک نہیں ہوتے ہیں اور نہ سامانِ عیش کے فراہم ہونے پر خدا سے گلہ وشکوہ کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ ایک دیندار ہونے کی وجہ سے ہے۔ جسطرح ایک دیندار کا آخری سہارا خدا ہوتا ہے اسی طرح مومن بھی خدا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔ جیسا خود کہا ہے کہ ؎

ہو نہ بیتاب غمِ ہجر بتاں میں مومنؔ　　　دیکھ دو دن میں بس اب فضلِ خدا ہوتا ہے

مومن اتفاقات وحادثات زمانے سے ناامید ہوکر ہمت نہیں ہارتے ہیں۔ کیونکہ ایک پکے دیندار ہیں اس وجہ سے یہ جانتے ہیں کہ یہ نظام قدرت ہے کہ برُے دنوں کے بعد اچھے اور اچھے دنوں کے بعد برُے دن بھی آتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ آج جس چمن میں خزاں کا دَور دَورہ ہے کل اس میں بہار کی حکمرانی بھی ہوگی اور آج جس چمن میں بہار کا گذر ہے کل اس میں خزاں کا قیام بھی ہوگا۔ مومن یہ سمجھتے ہیں کہ ویرانوں میں بستیاں بستی ہیں اور بستیاں ویران بھی ہوتی ہیں ان کو اس چیز کا احساس ہے کہ ہر مصیبت خوشی کا پیغام لاتی ہے اور خوشیاں کسی آنیوالی مصیبت کا پیش خیمہ۔ اس وجہ سے وہ کوئی بات اس اصولِ فطرت اور قانون قدرت سے ہٹ کر نہیں کرتے ہیں۔ نہ فلک کو ناہنجار و کج رفتار ہونے کا طعنہ دیتے ہیں۔

مومن اگر روٹھے ہوئے محبوب کو مناتے ہیں تو اس بات کے بھی متمنی رہتے ہیں کہ محبوب بھی کبھی ان کو منائے اور اس کے لئے وہ بسا اوقات محبوب کو دھمکیاں بھی دیتے ہیں جیسے ایک جگہ کہا ہے ؎

مجھ سے مِل ورنہ رقیبوں سے میں سب کہہ دونگا　　　دشمنی اب کی اور وہ پہلا اخلاص

اور ایک جگہ کہتے ہیں ؎

سب نوشتے ترے اغیار کو دکھلاؤں گا　　　جانتا ہے تو میرے پاس ہیں کیا کیا کاغذ

مومن بھی رقیب کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ مگر رقیب کو کوسنے نہیں دیتے ہیں بلکہ

خوش اسلوبی سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ جیسے ایک جگہ فرمایا ہے ؎

ہے نگاہ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے

اسکے علاوہ مومن دنیا سے یہ بھی کہتے ہیں کہ عشق بُری بلا ہے گو خود عشق کرتے ہیں مگر دنیا کو اس سے بچانے کے لئے اس کے نتائج سے آگاہ بھی کرتے ہیں ؎

قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق سچ تو یہ ہے بُری بلا ہے عشق

لیکن اسکے ساتھ ساتھ مومن مذہب کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔ ان کو اس بات کا اعتراف ہے کہ (یہ عشق اگر خدا سے ہوتا تو زیادہ بہتر تھا) بتوں کے کہے پر عمل کرنے سے زیادہ بہتر خدا کے حکم پر عمل کرنا ہے ۔جس کے نہ کرنے کا ان کو اعتراف ہے۔

مومن وارداتِ عشق کو بیان کرتے وقت دامنِ ادب و تہذیب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔ ان کا عشق وہ عشق ہے جو حسین ملبوسات میں پوشیدہ ہے بازاری نہیں ہے اور صرف خیالی بھی نہیں اسمیں حقیقی رنگ ہے کیونکہ اس میں مومن کا عشق جھلکتا ہے۔ جی ہاں یہ صحیح ہے کہ مومن کو ایک عورت مسماۃ امتہ الفاطمہ بیگم المعروف بہ صاحب جی سے عشق تھا جس کا تذکرہ "تذکرہ طبقات الشعراء" میں میاں کریم الدین اس طرح کیا ہے:۔ صاحب ایک عورت مسماۃ امتہ الفاطمہ بیگم جس کو صاحب جی بھی کہتے ہیں درمیان شاہجہاں آباد کے حکیم مومن خاں سے ملاقات اسکی بتقریب علاج کے ہوئی تھی۔ مدت تک آشنائی رہی کئی سال گذرے کہ وہ لکھنؤ چلی گئی۔ وہ ایک خانگی تھی۔ مثنوی قولِ غمیں مومن کی اسی محبوبہ کے عشق میں ہے۔ با سببِ فیض صحبت مومن خاں وہ بھی شعر کہنے لگی تھی۔ لیکن اگر مومن نے عشق کیا تو کیا غضب کیا دورِ ظفر کے اس بغداد میں عشق و عاشقی لازم و ملزوم سے ہو کر رہ گئے تھے اور مومن نے اسی شہر اور اس کے ماحول میں پرورش پائی تھی پھر وہ کس طرح اس سے الگ رہتے۔ خیر تو کلام مومن میں اسی عشق کا رنگ ملتا ہے۔ صحیح جذبات دل کی صحیح ترجمانی ہے اس میں نہ صرف خاص دِلّی والی زبان کی جھلک ہے بلکہ روزمرہ اور محاوراتی زبان کی بھی

مومن نے کیونکہ عریاں اور بازاری پن کو پسند نہ کیا اس وجہ سے ان کی غزلیں ادق اور مشکل ہو گئی ہیں۔ اس کے علاوہ مومن نے اپنے کلام کا انتخاب اسوقت شروع کیا جب وہ کوٹھے سے گر کر بستر مرگ پڑے ہوئے تھے۔ مومن بولتے جاتے تھے اور ان کے داماد مولوی عبدالغنی صاحب وکیل سیتاپوری لکھتے جاتے تھے۔ اب آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ صرف پانچ ماہ میں پورے کلام کا انتخاب کرنا اسے مرتب کرنا اور پھر عالم تکلیف میں اسی وجہ سے کلام ذرا ادق ہو گیا ہے۔ لیکن اگر مومن ایام محن کے علاوہ دور صحت میں یہ کام انجام دیتے تو واقعی بہت بہتر ہوتا۔ اس کے علاوہ کلامِ مومن میں حالاتِ زمانہ کا رنگ بھی ہے۔ جیسے ایک جگہ لکھا ہے کہ ؎

رام پور میں لایا جنوں کا شوق	ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ تر میں ہم

اس شعر کا پس منظر اوروں کے تحت "صاحب جی" کے عشق میں مبتلا ہو کر اس کی تلاش میں در بدر ٹھوکریں کھانا ہے مگر میں اس کا پس منظر جو اس دور کے ماحول کے مطابق سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اس میں اُس دَور کی دِلّی اور رامپور کا سیاسی پس منظر بھی پوشیدہ ہے اس شعر میں مومن نے دِلّی کو ویرانہ لکھا ہے اور وہ اس وجہ سے کہ اس بعد ادشاہجہانی و بابِل سراج الدین ظفر میں جہاں انسانیت تھی وہاں حیوانیت بھی تھی طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا جس کا تذکرہ انھوں نے جو قصیدہ حضرت ابو بکرؓ کی شان میں لکھا ہے اس میں اس طرح کیا ہے ؎

کوئی اس دور میں جئے کیونکر	ملک الموت ہے ہر ایک بشر
جس کو دیکھو سو مایۂ بیداد	کیا ہوا اگر نہیں ہیں سیم و زر
نہ امیروں کو پاسِ بندیٔ عدل	نہ رعایا مطیعِ فرمانبر
اس کو سو رستمِ زماں کا خطاب	جو کرے قتل خورد سالہ پسر

اس لئے مومن نے دِلّی کو ویرانہ اور رامپور کو ویرانہ تر اس وجہ سے لکھا ہے کہ دِلّی میں ان تمام عیوب کے علاوہ جو رامپور میں بھی تھے ایک عیب اور تھا جو دلّی میں نہ تھا۔ اور وہ یہ کہ دلّی کے عوام، روسار، شہزادگان، اور خود شاہ ظفر غیر ملکی غلامی کو برداشت کرنیکو تیار نہ تھے۔ مگر رامپور

کے نہ صرف عوام ورؤسا، بلکہ خود حاکم وقت تک اس چڑھتے ہوئے غیر ملکی سورج کی عبادت کے مقابلہ میں خاندان مغلیہ کے آخری ٹمٹماتے ہوئے چراغ بہادر شاہ ظفر جو آزادی و یکجہتی وطن کا آخری حصار تھے کی پرستش کرنے کو تیار نہ تھے وہ غیر ملکی غلامی میں خوش نظر آتے تھے۔ اس شعر کا پس منظر جیسا میں نے پہلے عرض کیا لوگوں نے کچھ اور بھی بیان کیا ہے۔ مگر مومن نے خود نہ تو اسکی وضاحت کی ہے نہ شرح لکھی ہے اب ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ طبع آزمائی کرے اسی وجہ سے میں جو مناسب سمجھا تھا عرض کر دیا۔ بہر حال مومن کے کلام میں حالاتِ زمانہ کا رنگ بھی ہے۔ اور صحیح جذباتِ دل کی ترجمانی بھی۔ لیکن وہ شاعری نہیں ہے جو غرضی ہو یا جسکو ذریعہ معاش بنایا گیا ہو۔ اسی وجہ سے مومن نے شاہ نصیر کی شاگردی کو جلد ختم کر دیا کیونکہ وہ ان کی خوشامدانہ شاعری کو پسند نہ کرتے تھے اور نہ ناسخ کے پہلوانی رنگ کو مومن مذہباً غیر مقلد تھے چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ انھوں نے نہ صرف شاہ نصیر کا ساتھ نہ دیا بلکہ کسی اور کے ساتھ بھی چلنا گوارا نہ کیا اور وہ اس وجہ سے کہ ایک تو مومن مذہباً غیر مقلد تھے اور دوسرے وہ بذاتِ خود میدانِ ادب میں ایک نیا راستہ تیار کر رہے تھے پھر بھلا وہ کسی کی تقلید کیسے کرتے۔ انھوں نے تو بذاتِ خود نہ صرف اپنے بعد کے آنے والوں کے لئے بلکہ اپنے لئے بھی میدانِ ادب میں ایک وہ روش بنائی جو نہ مذہب سے بیگانہ ہو نہ اخلاق سے عاری تاکہ شعراء ایک خاص سطح سے نیچے نہ گر سکیں، اور ان کا کلام کلام ہو اس میں تعیش پسندی نہ ہو بازاری پن نہ ہو۔ اور واقعی مومن نے نہ صرف دوسروں کیلئے یہ راستہ تیار کیا بلکہ خود بھی ہمیشہ اسی شاہراہِ ادب پر گامزن رہے۔ اسی وجہ سے فن غزل میں مومن کے ہم عصروں میں سوائے غالب کے سب ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ تاریخ ادب گواہ ہے کہ ہر شاعر نے شاعری کو ذریعہ معاش بنایا ہے ماسوائے مومن کے اور خاص طور سے فن قصیدہ تو شاید ایجاد ہی اس لئے ہوا تھا کہ خوشامد کر کے کسی کی تعریف میں جھوٹ کا طومار باندھ کر زمین آسمان کے قلابے ملا کر ذرے کو مہر درخشاں ثابت کر کے شکم پروری کی جائے۔ اور یہ ہو سکتا تھا کہ مومن اپنی آن اور خودداری کی بنا پر قصائد نہ کہتے تو لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ مومن اس فن سے ناواقف تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا مومن

نے قصائد کہے اور اسمیں بھی مومن نے ایک نئی چیز پیش کی۔ مومن نے قصائد کی وہ بزم سجائی ہے جس کے وہ خود ہی صاحب خانہ ہیں خود ہی رونق بزم اور خود ہی شمع محفل۔ مومن یہاں بھی ایک خاص اور نہ صرف خاص بلکہ افضل ترین مقام پر فائز ہیں۔ اردو ادب کے تمام درخشندہ ستارے اس صنف میں جب اس مہر درخشاں کے سامنے لائے جاتے ہیں تو ان پر کہر چھا جاتی ہے اور وہ ماند پڑ جاتے ہیں اور یہی وہ صنف ہے جسمیں انکے ہم عصر اور شعراء کا تو ذکر کیا "کتاب تصوف" کے مالک غالب جنکی اس کتاب تصوف اور شیدائیاں غالب کے لقول "ایک الہامی کتاب" جسکا سرمایہ مضامین نہ صرف امراء و روسا اور آخری تاجدار شاہ ظفر کی مدح سرائی بلکہ بعد غدر انگریز حکام کی چاپلوسی بھی ہے۔ اور جن کے کلام کو لوگ سرمایہ حریت وطن قرار دیتے ہیں جنکا ایک بھی قصیدہ یا قصائد کا کوئی ایک شعر بھی مومن کے مقابلہ پر نہیں لایا جا سکتا وہ مومن جو جہاد کے متمنی تھے۔ اور جنھوں نے کہا ہے ؎

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب	یہ افضل سے افضل عبادت نصیب
یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں	مری جاں فدا ہو تیری راہ میں
یہ گنج شہیداں میں مسرور کل	اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں

اوروں کا تو ذکر کیا جنکی عمر ہی کاسہ لیسی میں گذری ہو مگر کلام تصوف کے خالق جن کی آن اور خودداری بڑی مشہور ہے وہ مرزا غالب بھی اس صنف میں جب مومن کے سامنے لائے جاتے ہیں تو ان کا نہ صرف کلام ہی کم حیثیت نظر آتا ہے بلکہ ان کی حریت پسندی۔ وطن پرستی۔ ولایت۔ آن، اور خودداری بھی مومن کے آگے دم توڑ دیتی ہے۔ اس صنف میں مومن فانوس میں جلتی ہوئی اس شمع کیطرح ہیں جسمیں سے رنگا رنگ کی کرنیں چھوٹ چھوٹ کر نکل رہی ہوں۔ مگر شمع ایک ہی ہو۔ مومن نے ادب کے اس بحر ذخار میں بھی غوطہ لگایا مگر اپنے دامن کو گوہر مراد ریسے بھرنے کو نہیں بلکہ نقطہ ہنر شناوری دکھانے کو اور کسی کے آگے گھڑ نیرا ہوا یا دکٹورا سائیں کا بھر دے کہہ کر کاسہ لیسی نہیں کی بھیک نہیں مانگی۔ قصائد اس طرح کہے ہیں۔ ایک حمدیہ قصیدہ خدا کی شان میں ایک نعتیہ

قصیدہ سرورِ کائنات حضرت محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اس کے علاوہ چار قصیدے حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ حضرت عثمانؓ حضرت علیؓ کی تعریف میں اسکے علاوہ بھی قصائد ہیں مگر کسی رئیس نواب یا والئی ملک کی شان میں اپنی کم مائیگی کا رونا روکر طالب امداد ہونے کا نہیں ہے حد تو یہ ہے کہ ایک دفعہ مہاراجہ کپورتھلہ نے ہزاروں روپے سفر خرچ کو بھیجے اور تین سو روپے ماہوار پر شامل دربار ہونے کو کہا مگر جب مومن کو پتہ چلا کہ وہاں ایک گویئے کی تنخواہ بھی تین سو روپے ماہوار ہے تو یہ کہہ کر کہ "جہاں شاعر اور گویا برابر ہوں میں جانے کو تیار نہیں ہوں" جانے سے انکار کر دیا۔ کیوں؟ اس وجہ سے کہ ان کی خودداری کو ٹھیس لگتی تھی آن پر حرف آتا تھا اور ان کی اس حرکت سے ادب کے نام پر دھبہ لگتا تھا۔ کیونکہ مومن کسی کے ماتحت ہونا پسند نہ کرتے تھے اسی وجہ سے انھوں نے نواب وزیر الدولہ بہادر والی ٹونک کے بلانے پر بطور معذرت ایک قصیدہ لکھا ہے ؎

یاد ایّام عشرتِ فانی	نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
پر کروں کیا کہ بن نہیں آتی	ورنہ میں اور تیری مہمانی
ہے ابھی آرزوئے وصل صنم	ہے ابھی حسرتِ ہوس رانی

مومن تو آزاد زندگی کے عاشق تھے۔ پھر مومن کس طرح خود کو کسی کا غلام بنا سکتے تھے اور اگر اس دربار سے منسلک ہو جاتے تو اس صنف میں اپنا واحد مقام کیسے پیدا کر سکتے تھے وہ تو اس آزاد زندگی کے سچے عاشق تھے جو آرزوئے وصل صنم اور حسرتِ ہوس رانی سے ظاہر ہے۔ اور پھر یہ کہ یہاں بھی مومن کا خدا پرست ہونا آڑے آیا مومن سوائے خدا کے کسی پر بھروسہ نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی مصیبت کا حال خدا سے بیان کر کے اس سے طالب امداد ہوتے تھے اور یہ ہی مومن کی خدا پرستی اور مذہب پرستی تھی کہ جس نے ان کو دریدہ کاسہ لیس ہونے سے بچایا نہ صرف کاسہ لیس ہونے سے بچایا بلکہ انھیں حضرت سید احمد شہید بریلوی رحمتہ علیہ کا معتقد اور مرید کر دیا پھر بھلا ایسی بارگاہ کا معتقد اور مرید کسی صاحبِ ثروت کے آگے کس طرح سر جھکاتا اور کاسہ لیس ہوتا۔

مومن کو یہ شرف صرف حضرت سید احمد شہید ہی سے نہیں ملا بلکہ مومن کی مجلسی زندگی کا دیا دھنتہ جو اپنے گھر کے مذہبی ماحول میں بسر ہوا اس نے ان پر اثر ڈالا اور حضرت شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلوی کی مجالس اور تعلیم نے اس کو پختہ کر دیا۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ مومن نے جگہ جگہ غزلیات میں بھی مذہب کو شامل کیا ہے اور ہمیشہ جہاد کے متمنی رہے ہیں گو کہ ان کی یہ آرزو پوری نہیں ہوئی۔ مومن کے متعلق بقول مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی مولانا فضل حق خیرآبادی اسیر کالا پانی بعد غدر ۱۸۵۷ء کا فرمانا ہے کہ "مومن ایک ایسا بھیڑیا ہے جسکو اپنی طاقت کا اندازہ نہیں۔ جو اگر مجاہد ہوتا تو اپنے ساتھ والوں کے دلوں میں آتشِ جہاد بھر دیتا اور دشمنوں کی صفوں کو اُلٹ دیتا۔ جو اگر مذہب کی طرف مائل ہوتا تو امام وقت ہوتا۔" غرضیکہ اس صنف میں مومن واحد آدمی ہیں جنھوں نے ایک نئی راہ نکالی۔ ایک نئی بزم جمائی۔ جہاں ان کے ہم عصر غالب بھی ان سے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ قصائد میں ذوق کا مقابلہ مشکل ہے مگر مومن نے جس انداز میں قصائد کہے ہیں اس کسوٹی پر ذوق بھی پورے نہیں اترتے۔

مثنوی:۔ مومن شاعری کی اس صنف پر بھی پوری طرح قادر نظر آتے ہیں۔ مومن کی مثنویاں تقریباً دس ہیں۔ جن میں سے ایک قولِ غمیں اپنی محبوبہ امتہ الفاطمہ کے عشق میں ہے ایک مثنوی جہاد ہے اس کے علاوہ ساری مثنویاں ان کے اپنے عشق سے متعلق ہیں اور آپ بیتی کہلانے کی مستحق ہیں۔ کیونکہ مومن کا عشق عشقِ حقیقی نہ تھا اور نہ ان کو اپنی ولایت کا دعویٰ تھا اس وجہ سے ان مثنویوں میں بعض جگہ عریانی بھی پیدا ہو گئی ہے مگر پرواز تخیل، وقت پسندی، مضمون آفرینی، معاملہ بندی کی وجہ سے مومن کی استادی کا لوہا ماننا پڑتا ہے۔ اس صنف میں بھی مومن کے ہمعصر شعراء اور خاصکر ذوق و غالب بھی ان سے پیچھے نظر آتے ہیں۔ غالب نے گو کہ آم کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے وہ مثنوی کہی جاسکتی ہے مگر وہ نہ ہونیکے برابر ہے اسی لئے مومن اس صنف میں ذوق و غالب سے بھی آگے ہیں۔ اس کے علاوہ مومن کی مثنویات عام فہم بھی بہت ہیں۔

رباعیات:۔ چار مصرعوں میں ایک خیال کو پورے طور سے حسین انداز میں پیش کرنا اور اسطرح کہ ہر ایک اسکو مکمل سمجھے اس فن پر جیسا عبور کہ مومن کے بعد آنیوالے شعرا بس سو انیس، دبیر اور مولانا حالی کو حاصل ہے مومن کو نہیں ہے. مگر مومن اپنے ہم عصروں میں ضرور درجہ فوقیت رکھتے ہیں. مومن کی رباعیات ردلیف وار کل ۱۳۱ ہیں۔

اس کے علاوہ مومن کے مسدس، مثمن، مخمس، مثلث، وغیرہ بھی ہیں. انمیں سے زیادہ تر ان کی اپنی نظمیں ہیں مگر دوسروں کے اشعار پر تضمین بھی کی ہے مگر اس طرح کہ جن پر تضمین کی ہے وہ بھی مومن کے مصرعوں کے ساتھ اس طرح ملے ہیں کہ دوسروں کے مصرعے بھی مومن کے لگتے ہیں یا مومن کے مصرعے دوسروں کے معلوم ہوتے ہیں. غرضیکہ آپس میں ملنے کے بعد مصرعوں کی تمیز مشکل ہو جاتی ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ مومن نے تاریخی قطعات اور تاریخیں اس انداز میں پیش کی ہیں کہ ان کا جواب نہیں ہے۔ اور یہاں بھی مومن نے ایک عجیب رنگ پیدا کیا یعنی پورے مصرعے یا شعر سے تاریخ نہیں نکالی بلکہ جیسے اپنے والد کی وفات پر کہا ہے ؎

بمن الہام گشت سال وفات　　　　که غلام نبی بحق پیوست

اب آپ غلام نبی کو حق سے پیوست کر کے سال وفات نکال لیجئے. اس کے علاوہ بات میں بات پیدا کرنا معمولی بات تھی مثلاً ایک صاحب حج کو گئے مگر راستے سے واپس آگئے تو مومن نے ان کیلئے تاریخ کہی

چوں بیاید ہنوز خر باشد (۱۲۵۶)

آپ پوری تاریخ ادب چھان لیجئے مگر مقطعے میں ہر جگہ تخلص کا نباہ نہ صرف یہ کہ جیسا مومن کے کلام میں ہے اور کسی کے یہاں نہیں بلکہ مومن پر اس فن کا خاتمہ ہو گیا ہے.

ان تمام خوبیوں کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ نہ صرف مومن کے ہم عصروں بلکہ اردو ادب میں ایسا کوئی شاعر نظر نہیں آتا جو مومن کی طرح ادب کی تمام اصناف پر پوری طرح قادر ہو۔ مومن کا صرف اردو کلام ہی نہیں بلکہ فارسی کلام بھی اسی طرح بہترین

ہے اور ان کی خطوط نویسی بھی۔

اور صرف شاعری کا کیا ذکر مومن ایک بہترین شاطر، بہترین منجم، بہترین رمال ریاضی داں بہترین طبیب اور بہترین موسیقی دان تھے۔ حد تو یہ ہے کہ مومن کے مرنے کے بعد دِلّی کے بہترین بین باز نظیر نے یہ کہہ کر بین رکھدی کہ "دِلّی میں اب کوئی قدردان نہیں رہا۔" اور شاید اسی وجہ سے غضب کا ترنم پایا تھا اکثر لوگ مومن کو ترنم سے اشعار پڑھتے سننے کیلئے بیقرار رہتے تھے شعر اس انداز میں پڑھتے تھے کہ مکمل شعر کی تصویر بن جاتے تھے۔ ہر اچھے شعر کی داد دیتے تھے۔ ایک دفعہ جمعہ کی نماز پڑھ کر گھر آرہے تھے کہ چند بچوں کو سڑک پر اپنے مٹی کے گھروندے بناتے دیکھ کر پوچھا " میاں کیا کر رہے ہو" ایک بچے نے تتلا کر کہا میاں تر تار ہے ہیں (یعنی کر کیا رہے ہیں) ؎

توئے جانا سے تھات لاتے ہیں — اپنا تابہ الد بناتے ہیں

(یعنی ؎ کوئے جاناں سے خاک لاتے ہیں — اپنا کعبہ الگ بناتے ہیں)

اس شعر کو سُن کر مومن وہیں سڑک پر بیٹھ گئے بچے سے کئی دفعہ شعر سُنا اسکو چمکارا پیار کیا اور گھر لا کر بہت خاطر تواضع کی۔ میں نے یہ واقعہ جن صاحب سے سنا ہے ان کے متعلق خیال یہ ہی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔

غرضیکہ مومن نے ہر فن کو سیکھا مگر فن کیلئے سیکھا اسکو ذریعہ معاش نہیں بنایا۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومن ہر اعتبار سے ایک کامل آدمی تھے۔ اور کیونکہ اپنی مذہبیت کی وجہ سے نہ شرابی بنے نہ جواری اسی وجہ سے مومن کا دامن پاک رہا مومن نے کسی سے اپنے آپ کو ولی منوایا نہیں زمانہ خود انھیں ولی تسلیم کرنے پر مجبور ہوا ہے لیکن افسوس ہے کہ مومن کو زمانے نے بھلا دیا تھا حد تو یہ ہے کہ مولانا آزاد جیسی شخصیت نے آبِ حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن کا کوئی تذکرہ نہیں کیا پھر لوگوں کے اعتراضات کے بعد دوسرے ایڈیشن میں مومن کو شامل کیا گو کہ مولانا محمد حسین آزاد نے دوسرے ایڈیشن میں معذرت کی ہے کہ ان کو مومن کے

حالات نہ مل سکے تھے مگر اس کا یقین کیسے کر لیا جائے اور پھر جبکہ آزاد مرحوم نے خود وہ زمانہ دیکھا تھا جس میں مومن حیات تھے اور مومن نے وفات بھی مولانا آزاد مرحوم کے سامنے ہی پائی ہے۔ مولانا آزاد نے یقیناً مومن کو دیکھا بھی ہوگا اور خود مومن سے ان کا کلام بھی سنا ہوگا۔ کیونکہ وہ اس وقت بچہ نہ تھے۔ پھر کس طرح ان کے اس عذر کو صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال کچھ ہو زمانہ مومن کو بھول ضرور تھا لیکن خدا کا شکر ہے کہ کچھ عرصے کے بعد لوگوں نے پھر مومن کو یاد کیا۔ اس بیسویں صدی میں دنیا کو مومن سے روشناس کرانے اور منظر عام پر لانے کا سہرا مولانا ضیاء احمد صاحب بدایونی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سر ہے کہ جنھوں نے مومن کے صحیح حالات اور کلام سے دنیا کو روشناس کیا۔

اس کے بعد اور لوگ بھی اس طرف متوجہ ہوئے اور ان میں ایک راقم الحروف بھی ہے۔ میں نے اس انتخاب میں اس کا خیال رکھنے کی کوشش کی ہے کہ عام فہم انتخاب ہو تاکہ مومن کو عوام اور موجودہ زمانے کے زیادہ سے زیادہ قریب لا سکوں۔ اب تک کوئی انتخاب ایسا نہیں ہوا تھا جس میں جستہ جستہ سارے کلام کا نمونہ پیش کیا گیا ہو۔ اس لئے میں اس بات پر فخر کر سکتا ہوں کہ یہ سعادت میں اس انتخاب کو پیش کر کے حاصل کر رہا ہوں۔

شروع میں جب یہ کام شروع کیا تھا تو بہت سے ساتھی ساتھ تھے مگر اس منزل کے ہر مشکل مرحلے پر جب پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک نہ ایک ساتھی چھوٹا ہوا دکھائی دیا اور آخرکار جب یہ کام ختم ہوا تو منزلِ مقصود پر صرف میں اور میرے چند ساتھی ہی نظر آئے جن میں سب سے پہلے محمد احسن صدیقی بی اے کا مشکور ہوں کہ انھوں نے نہ صرف میرا ساتھ دیا بلکہ میں جب راہ پر خار دیکھ کر اور آبلہ پائی سے تھک کر ہمت ہارنے لگتا تھا تو احسن نہ صرف ساتھ دیتے تھے بلکہ خود آگے قدم بڑھا کر میری ہمت بھی بندھاتے تھے۔ اس کے بعد اپنے استاد شفیع الدین نیر صاحب پروفیسر جامعہ کالج کا ممنون ہوں جنھوں نے مجھے صحیح مشوروں سے نوازا اور اپنے اُستاد حافظ فیاض احمد صاحب اور برادرم محمد یونس خاں منیجر سنگم کتاب گھر کا مشکور ہوں کہ جن کی مدد کے

بغیر شاید یہ کلام پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکتا تھا۔ میں والد بزرگوار قبلہ اسرار حسن خانصاحب کا انتہائی مشکور ہوں کہ جنھوں نے اپنی علالت کے باوجود نہ صرف صحیح نسخے اور صحیح غزلوں کے انتخاب میں میری مدد کی بلکہ میرے لئے دعائیں بھی کرتے رہے اور میری ہمت بھی بندھاتے رہے آج میں انکی دعاؤں کے طفیل ہی اس کام کو مکمل کرسکا ہوں فیروز آرٹسٹ کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی آن کے خلاف مجھ کو ٹائیٹل فوراً تیار کر کے دیدیا۔ اب آخر میں حضرت مولانا ضیا احمد صاحب بدایونی ریڈر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جن کو مومن سے ایک خاص رشتہ اور واسطہ ہے جو نہ صرف اس قافلے کے میرِ کارواں ہیں بلکہ سنگ میل بھی ہیں کا بہت شکر گذار ہوں جنھوں نے واقفیت نہ ہونے کے باوجود بھی استاد محترم ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی سفارش پر نہ صرف یہ کہ تقریب ہی لکھی بلکہ مجھکو صحیح مشوروں سے نوازا اور اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود اپنا قیمتی وقت خرچ کرکے جستہ جستہ غزلیات کی تصیح بھی فرمائی ہے۔ امید ہے کہ حضرت مولانا صاحب اس جسارت کیلئے مجھ کو معاف فرمائیں گے کہ میں نے ان کا شکریہ سب سے آخر میں ادا کیا ہے۔

بہرحال یہ انتخاب حاضر ہے میں نے ہر امکانی کوشش کر کے جو کچھ میں بہترین کرسکتا تھا کیا ہے۔ اب اس کا فیصلہ آپکے ہاتھ ہے کہ یہ کام کیسا ہے۔ اگر آپ اپنی رائے اور میری غلطیوں سے مجھ کو مطلع کریں تو عین نوازش ہوگی۔

خادم

عبدالودود خاں

۲-۱۰ احمد منزل کلاں محل دہلی

نوٹ:۔ زیر نظر انتخاب کی تیاری میں کلامِ مومن از حسن عسکری صاحب بھوپالی مطبوعہ گورنمنٹ پریس بھوپال کلیات مومن از ڈاکٹر عبادت بریلوی صاحب مطبوعہ ادارہ کتابی دنیا کراچی لاہور۔ دیوانِ مومن مطبوعہ نولکشور پریس۔ دیوانِ مومن از مولانا ضیاء احمد صاحب

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعرا کے امام کو

ولادت ۱۲۱۵ھ　　　　وفات [illegible]

امام الشعرا رئیس المتغزلین حکیم مومن خاں مومن

بعونِ صانعِ مکین و مکان بفضلِ خلاقِ زمین و زمان
۲۸
اردو کا کلاسیکی ادب
کلیاتِ مومن
جلد اول
محمد مومن خاں مومن
ناشر
مجلسِ ترقی ادب
نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ
لاہور

طبع اول : جولائی ، ۱۹۶۴ء

تعداد : ۱۱۰۰

ناشر : سید امتیاز علی تاج ، ستارۂ امتیاز
ناظم مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

مطبع : مطبع عالیہ ، لاہور

مہتمم : ظفرالحسن رضوی

سرورق : زرین آرٹ پریس ، ۶۱ ریلوے روڈ ۔ لاہور

قیمت : سات روپے

مقدمہ

(۱)
حیات و تصانیف

محمد مومن خاں ۱۲۱۵ھ (۱۸۰۰ع) میں پیدا ہوئے[1] ۔ وفات ۱۲۶۸ھ (۱۸۵۲ع) ۔ والد کا نام حکیم غلام نبی خاں ولد نامدار خاں تھا ۔ نامدار خاں اور کام دار خاں دو بھائی شاہ عالم ثانی کے زمانے میں کشمیر سے آ کر دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اور شاہی طبیبوں میں داخل ہوئے ۔ روایت ہے کہ ابتدائی تعلیم شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے میں پائی ۔ یہ مدرسہ مومن خاں کے مکان سے بہت قریب تھا ۔ یوں ان کے والد کو شاہ عبدالعزیز صاحب سے گہری عقیدت تھی، اس بنا پر بھی ان کے مدرسے میں تعلیم پانے کی روایت عام ہوئی ۔ جب بڑے ہوئے تو عربی کی ابتدائی کتابیں شاہ عبدالقادر صاحب سے پڑھیں ۔ کریم الدین کی روایت کے مطابق عربی ''شرح ملا'' تک پڑھی اور فارسی بھی خوب جانتے تھے اور حافظ قرآن بھی تھے ۔ طب جو کہ خاندانی فن تھا ، باقاعدہ پڑھی اور مطب میں نسخہ نویسی کی اور بعد میں نواب فیض محمد خاں والئی جھجر کے دربار میں تین ماہ تک شاہی طبیب رہے ، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ

۱۔ مومن کی تاریخ ولادت کے سلسلے میں کلب علی خاں فائق نے اپنی کتاب مومن (شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور) میں محققانہ بحث کی ہے ۔

مومن خان نے طب سے زیادہ شاعری کو اپنا پیشہ بنایا ۔ اس کے علاوہ علم نجوم و رمل میں مہارت حاصل کی ؛ چنانچہ اس کے اشارے ان کے اشعار میں موجود ھیں ۔ شطرنج میں شہر کے اچھے ماہرین میں شمار ھوتے تھے ۔ موسیقی میں بھی کمال حاصل کیا اور تعویذ نویسی اور عملیات میں بھی دخل تھا ۔

شاعری کا مشغلہ اوائل عمر ھی میں شروع ھوگیا تھا ۔ فائق کی تحقیق ھے کہ بارہ برس کی عمر تھی کہ ''مثنوی شکایت ستم'' (۱۲۲۷ھ) لکھی ۔ اس میں اپنی شعر گوئی کا ذکر کیا ھے ۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی ، پھر اپنا انداز خود پیدا کر لیا ۔

تصانیف :

مومن کی تصانیف یہ ھیں :

۱ - کلیات اردو : مومن کا اردو کلام سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے ۱۲۴۳ھ میں جمع کیا اور اس پر ایک دیباچہ لکھا ۔ یہ دیوان پہلی بار باہتمام مولوی کریم الدین مطبع رفاہ عام دھلی میں ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ع میں چھپا تھا ، بعد میں اور ایڈیشن بھی نکلے ۔

دیوان مومن کا ایک اور نسخہ عبدالرحمان آھی نے ترتیب دیا جو ۱۸۷۳ع میں پہلی بار مطبع نول کشور میں چھپا ۔ دیوان مومن مرتبہ ضیاء احمد بدایونی ۱۹۴۳ع میں الہ آباد سے شائع ھوا ۔

اردو کلیات میں ۹ قصیدے ھیں ۔ حمد ، نعت ، منقبت خلفائے راشدین ، منقبت حضرت امام حسن ، وزیر الدولہ نواب محمد وزیر خان والیٔ ٹونک ، مدح راجا اجیت سنگھ برادر راجا کرم سنگھ رئیس پٹیالہ ۔

غزلیات کے علاوہ فردیات ، قطعات رباعیات ، مستزاد ، مسمطات ،

ترجیع بند ، ترکیب بند اور مثنویات بھی ھیں -
مثنویات میں دو منظوم خط اور مندرجہ ذیل مثنویاں ھیں :
(۱) شکایت ستم - (۲) قصۂ غم - (۳) قول غمیں - (۴) تف آتشیں
(۵) حنین مغموم - (۶) آہ و زاریٔ مظلوم - (۷) مثنوی جہادیہ
اور دو تین اور منظومات ھیں -
۲ - دیوان مومن فارسی : مرتبہ حکیم احسن اللہ خاں -
۳ - انشاے مومن خاں (فارسی) : مرتبہ حکیم احسن اللہ خاں
مطبوعہ ۱۲۷۱ھ -
ان تصانیف کے علاوہ جان عروض ، شرح سدیدی و نفیسی ، رسالہ خواص پان اور غیر مطبوعہ کلام مومن کا بھی ذکر آتا ھے -
مومن کے وضع و لباس کا ذکر کئی معاصر تذکروں میں آیا ھے : رنگین طبع ، رنگین مزاج ، خوش وضع ، خوش لباس کشیدہ قامت ، سبزہ رنگ ، سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال جن میں ھر وقت انگلیوں سے کنگھی کیا کرتے تھے ، ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھیلے پائنچے ، اس میں لال نیفہ بھی ھوتا تھا -
مومن عاشقانہ طبیعت رکھتے تھے ، مزاج میں زود مشتعل جذباتیت تھی - شاعری کی ابتدا بچپن ھی سے ھو جانا ذھانت اور شدت جذبہ کا ثبوت ھے - انھوں نے اپنی محبت کے جو قصے اپنی مثنویوں میں خود بیان کیے ھیں ان سے طبیعت کی آزادی اور وارفتگی کا حال معلوم ھوتا ھے ، لیکن ذھنی طور پر بعض مذھبی عقائد سے خاص دلچسپی ھمیشہ رھی - حضرت سید احمد بریلوی کو مہدی دوران سمجھتے تھے - آخری عمر میں نماز روزے کے پابند ھوگئے تھے -
دھلی کو چھوڑ کر سہارنپور ، سہسوان ، بدایوں ، رام پور جہانگیر آباد بھی گئے لیکن مستقلاً دلی کو چھوڑ نہ سکے -
قصیدے بھی لکھے لیکن مزاج قصیدہ نگاری کے لیے بطور خاص

موزوں نہ تھا ۔

مثنویات وصف الحال ہیں لیکن مثنوی نگاری میں قصہ پن نہیں پیدا کر سکے ، سیدھی سادی سپاٹ روداد عشق ہے ، بعض جگہ جزئیات نگاری اچھی کی ہے ۔

رباعیات بھی لکھی ہیں لیکن ان میں کوئی خاص بات لائق ذکر نہیں ۔

ان کی واسوخت مشہور ہے ، یہ رنگ ان کی طبیعت کے مطابق تھا اس لیے اس میں قلم خوب رواں ہوا ہے ۔

ان کی فارسی شاعری معمولی ہے ، مگر اس سے ان کی استعداد کا پتا چلتا ہے ، ذہانت اس میں بھی ہے ۔

مومن کے شاگردوں میں اور لوگوں کے علاوہ شیفتہ مصنف ''گلشن بے خار'' بھی تھے اور امۃ الفاطمہ 'صاحب جی' تھیں جو ''قول غمیں'' کا موضوع ہیں ۔

مومن پر کام کرنے والوں میں پرانے تذکرہ نگاروں کے علاوہ نیاز فتح پوری (نگار ، 'نیاز نمبر' کے مرتب) عرش گیاوی (حیات مومن کے مصنف) ضیاء احمد ضیا بدایونی (دیوان مومن کے مرتب) نواب جعفر علی خاں اثر ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی (مصنف مومن و مطالعۂ مومن) اور جناب کلب علی خاں فائق (مصنف مومن) ممتاز ہیں ۔

———

(۲)
کلام مومن

آتش نے کہا تھا : ع

''غزل کہتے نہیں ہم ایک گھر آباد کرتے ہیں ۔''

آتش نے غزل کا گھر آباد کیا اور کس طرح کیا ، اس حقیقت سے تو سبھی باخبر ہیں مگر جب مومن نے کہا : ع

مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

تو یہ بات کسی کی سمجھ میں آئی اور کسی کی سمجھ میں نہ آئی ۔ مومن کا مطلب تو صاف ہے کہ میری غزل کے سامنے سب کے سر احترام سے اسی طرح جھک جاتے ہیں جس طرح مسجد میں لوگوں کے سر جھک جاتے ہیں ۔ مگر اس شاعرانہ دعوے کی حقیقت تشریح کی محتاج ہے ۔

مومن کے مصرع مذکور میں مسجد کا استعارہ ان کے مذہبی خلوص کا بھی آئینہ دار ہے لیکن اس سے زیادہ ہم اسے ان کے شعری خلوص یا جذباتی سچائی کا آئینہ دار کہہ سکتے ہیں ۔ مومن آخر وہی تو ہیں جن کے قلم نے اردو غزل کو ''پردہ نشین'' کے استعارے سے روشناس کرایا اور یہ سمجھایا کہ محبت صرف بازار حسن ہی میں نہیں ہوتی ، اس کا گزر چلمن کی تیلیوں کے پیچھے بھی ہو سکتا ہے : تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مومن نے کچھ نئی باتیں اور انوکھے خیالات ہمیں دیے اور جب اس قسم کا کوئی انکشاف کسی شاعر کے بارے میں ہو جاتا ہے تو وہ توجہ کا

حق دار بن جاتا ہے۔

مطالعۂ مومن کی یہ صورت اتفاق سے نکل آئی ہے[1] اور میں اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مطالعے کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں :

(۱) شخصیت کا انعکاس شاعری میں۔
(۲) طرز بیان۔
(۳) رتبہ۔

یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ مومن کی شخصیت مختلف اور متضاد عناصر سے مرکب تھی۔ ایک طرف فنون لطیفہ کا ذوق، طب میں دست گہ، رمل اور جفر کا شوق، پھر شاعری اور اس پر عاشقی، اور دوسری طرف جذبۂ جہاد اور جوش مذہبی۔ مومن نے زندگی کے تجربوں میں ان تضادوں کو کچھ اس طرح جذب کر لیا تھا کہ یہ تضاد برے معلوم نہیں ہوتے۔ عام طور سے نیکی اور خوش وقتی کا اجتماع ذرا مشکل ہی سے ہوا کرتا ہے لیکن مومن کی زندگی میں یہ اجتماع ہوا۔ غور فرمائیے کہ جو شخص یہ کہہ رہا ہو :

مرا حیرت زدہ دل آئنہ خانہ ہے سنّت کا

یا

جلد مومن لے پہنچ اس مہدیٔ دوراں تلک

یا

مومن تمہیں کچھ بھی ہے جو پاس ایماں
ہے معرکہ جہاد چل دیجے واں

۱۔ نگار کے مومن نمبر میں نیاز صاحب نے مومن کا جس طرح تعارف کرایا ہے، وہ اتنا تسلی بخش ہے کہ اب قلم اٹھانے کی ضرورت نہ تھی لیکن مقدمۂ کلام مومن لکھنے کی مجبوری پیش آ گئی۔

انصاف کرو خدا سے رکھتے ہو عزیز
وہ جان جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

انھوں نے ایک مےکدے کی بنیاد کی تاریخ بھی لکھی :

خوش وقت رائے مےکدۂ نو بنا نہاد
خوش وقت مےکشاں بزندان شوق اسیر
من از خمار حسرت تاریخ پا بہ گل
اندیشہ رقص ھا زدہ مستانہ در ضمیر

مگر سچ تو یہ ہے کہ بوالعجبی انسان کی تقدیر ہے - جو لوگ زندگی کو حساب کا سوال سمجھتے ھیں اور اس فارمولے سے زندگی کی میزان اور حاصل ضرب کو ٹھیک بٹھانا چاھتے ھیں ، وہ اکثر پریشان رھتے ھیں کہ ھائیں ! ایک ھی شخص بیک وقت اتنا رند اور پھر اتنا نیک بھی ، لیکن یہ ان کی بھول ہے - نیکی اور آزادی انسان کے خمیر میں کچھ اس طرح ملی جلی اور گھلی ملی نظر آتی ہے جیسے تانے بانے میں سرخ دھاگا زرد دھاگے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے - ان دھاگوں کو الگ الگ کرنے سے دھاگے تو الگ ہو جائیں گے مگر انسانی شخصیت کی قبا تار تار ہو جائے گی - مومن تو مومن صورت پرست تھے ، کسی معنی پرست کی زندگی میں بھی یہ تجرید ممکن نہیں -

شیفتہ نے گلشن بے خار میں مومن کے متعلق لکھا ہے :

" با این همه صفات کہ مذکور شد بے تحریک محرکے بہ فکر سخن نمی پردازد ؛ چناںچہ اکثر کلامش بخواہش داعی آثم صورت ظہور گرفتہ - "

معلوم نہیں اس سے شیفتہ کا مطلب کیا ہے ، شاید یہ کہ مومن کی شاعری کا بیشتر حصہ کسی تحریک کا ممنون احسان ہے

اور بہ قول شیفتہ ، شیفتہ خود بھی محرک ہوئے ہیں ۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن شیفتہ کے قول سے یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ مومن کی شاعری وقتی اور واقعاتی ہے ۔

یہ خاص واقعات کیا تھے ؟ ان کے حالات زندگی سے جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ ہے کہ انھوں نے عاشقی بھی کی اور مجاہدی کا دم بھی بھرا ۔ ان کی غزل اور مثنوی میں اس عاشقی اور مجاہدی کے نقوش ملتے ہیں ؛ چنانچہ غزل میں ان خاص واقعات کو عام بنا کر اور مثنوی میں ان واقعات کو بجنسہ منتقل کر دیا ہے ۔

ایک بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے غزل میں جو کچھ کہا ہے اس میں وہ دوسرے شاعروں کی طرح بہت اونچے نہیں اڑے ، زمین کی باتیں بر سر زمین ہی کی ہیں ۔ صوفیانہ عشق کے بندھنوں سے ان کی غزل خالی ہے ۔ ان کا یہ عشق عام انسانی سطح کا عشق ہے ۔ امداد امام اثر اس کو کوچہ گردی کہتے ہیں ، مگر انسانی سطح کے عشق میں کوچہ‌گردی تو ہوتی ہی ہے ، اور اگر کوچہ‌گردی کو برا بھی سمجھ لیا جائے تو مومن کے حق میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی عاشقی اقرار و اعتراف کے شرف سے مشرف ہے ۔ انھوں نے جس قسم کی عاشقی کی اس کو چھپایا نہیں اور مثنویات میں تو سب کچھ صاف لکھ دیا ہے بلکہ غزل میں بھی رمزیت کے پورے نقاب کے باوجود وہ اپنے محبوب کا اتا پتا صحیح بتا دیتے ہیں ۔ جب وہ کہتے ہیں :

مجھے پہنچا دو میرے صاحبؓ تک
کہ غلام گریز پا ہوں میں

یا یہ فرماتے ہیں کہ :

کیوں لگے دینے خط آزادی
کچھ گنہ بھی غلام کا صاحب[1]

تو یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہتی کہ وہ امۃالفاطمہ صاحب کا ذکر فرما رہے ہیں ۔ شیفتہ کو بھی اس کا سب حال معلوم تھا اور ان کے علاوہ دوسرے لوگ بھی یہ جانتے تھے مومن کی شاعری میں پردہ نشین کا ذکر بار بار آتا ہے ۔ اور بعض اہل قلم کو اس کے سمجھنے میں دشواری پیش آئی ہے ، لیکن ظاہر ہے کہ پردہ نشین سے مراد مومن کے وہ محبوب ہیں جن کے نام مومن ظاہر کرنا نہیں چاہتے ، اس کے باوجود ان کو ظاہر بھی کرنا چاہتے ہیں ۔ اس خصوصیت کے اظہار کے لیے مومن نے پردہ نشیں کی اصطلاح وضع کی ہے :

عشق پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے

پردے کی کچھ حد بھی ہے پردہ نشیں
کھل کے مل بس منہ چھپانا چھوڑ دے

بس کہ پردہ نشیں پہ مرتے ہیں
موت سے آنے ہے حجاب ہمیں

مومن کی مثنویات سے ان کے مذاق عاشقانہ (یا مزاج عشق) کا پتا چلتا ہے ۔ راز داری ، چھپ چھپ کر ملنا اور راز کا افشا ہونا یہ چیز ان کی عاشقانہ مثنویوں میں مشترک ہے ۔ اس سے یہ اندازہ

---

۱ - اس ساری غزل میں صاحب کا لفظ آیا ہے ۔ بظاہر تمام اشعار میں امۃ الفاطمہ المتخاص بہ صاحب سے خطاب معلوم نہیں ہوتا مگر صاحب کا بہ کثرت استعمال ظاہر کرتا ہے کہ کنایتاً صاحب ہی مدنظر ہیں ۔

ہوتا ہے کہ مومن کی عاشقی میں کوچہ گردی سے مراد وہ کوچہ نہیں ہوگا جہاں ہر کوئی پہنچ سکتا ہے کیوں کہ اس کوچے میں راز داری کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا ۔ جہاں سب کے راز سب پر ظاہر ہوں وہاں راز کوئی راز نہیں رہتا ۔ مومن کا بازار حسن ایسے کوچوں سے متعلق معلوم ہوتا ہے جہاں راز بہر حال راز ہے ۔

اس کے باوجود مومن کی شاعری میں عاشقی کی وہ فضا بھی ہے جو شاہدان بازاری سے مخصوص ہے ۔ رقیب بھی ہے ، غماز بھی ہے ، ناصح بھی ہے ، تماشاے عام اور ہجوم عشاق بھی ہے ۔ یہ سب کچھ بازاروں میں ہوتا ہے اور مومن کی غزل میں یہ نقشے بھی ہیں لیکن اکثر باتیں رسمی اور روایتی انداز میں بیان ہوئی ہیں ۔ اگرچہ یہ باور کرانے کے لیے وزنی اور معقول وجوہ درکار ہیں ۔ اور یہ تو تسلیم ہی ہے کہ مومن کی زندگی کا ایک دور اس کوچے میں بھی بسر ہوا ؛ چناں چہ کریم الدین نے گواہی دی ہے کہ ''بہت خلیق ، حلیم اور ظریف آدمی ہیں ۔ ابتدا میں تمام اوقات شعرگوئی اور لہو و لعب دنیا میں صرف کرکے تمام مزے عیاشی کے اٹھا کر اب توبہ کی بلکہ شعر کہنا بھی چھوڑ دیا ۔'' اس لیے اس کوچے کی باتوں کا بھی ان کی شاعری میں آ جانا محل تعجب نہیں ۔ پھر بھی پردہ نشین کا خاص اہتمام سے متواتر ذکر یہ ظاہر کرتا ہے کہ انھیں محبت کا غم اور اس غم کی محبت کسی ایسے ہی کوچے سے ارزانی ہوئی ہوگی جہاں نارسائی اور ناکامی کے کانٹے بھی بچھے ہوئے تھے ۔ اس ناکامی کا احساس ان کی غزلیات میں موجود ہے ۔ ان کا لہجہ ان کی دبی دبی جھنجلاہٹ کا پتا دیتا ہے ، جیسا کہ انداز بیان کے ضمن میں میں نے واضح کیا ہے ۔ مولانا آزاد اور بعض دوسرے مقتدر اہل قلم نے مومن کے ذکر کے ساتھ جرأت کی معاملہ بندی کا بھی ذکر کیا ہے ۔ اس قسم کے

موازلوں سے بڑی پریشانی ہوتی ہے ۔ مومن اور جرأت کی زندگیاں
مختلف تھیں اور ماحول بھی مختلف : محض اس وجہ سے کہ مومن
نے وہ غزل لکھ دی جس کا مطلع ہے :

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن کو جرأت کا ہم رنگ کہہ دینا محض عجلت فکر ہے ۔
مولانا محمد حسین آزاد اردو فارسی ادب کے رمز آشنا نقاد ہیں ۔
ادب و لحاظ ان کی طبیعت کا خاصہ ہے ۔ ناگواری کے باوجود
دل جوئی کا انداز ان کے قلم کی کشادہ دلی اور شیریں زبانی کا
کرشمہ ہے ۔ وہ تو یہ فرماتے ہیں کہ '' ان میں (یعنی غزلوں میں)
معاملات عاشقانہ عجب مزے سے ادا کیے ہیں، اس واسطےجو شعر
صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے اور اس پر وہ خود بھی
نازاں تھے ۔'' اس بیان کو غور سے پڑھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے
کہ مولانا آزاد جرأت اور مومن کی وقتی اور گاہے گاہے کی مماثلت کا
ذکر فرماتے ہیں ، '' اس لیے یہ کہا ہے کہ جو شعر صاف ہوتا
ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے''۔ جو شعر صاف نہیں اس میں
وہ جرأت سے الگ ہیں اور غالباً مومن کا اکثر کلام (خصوصاً
طرز ادا کے لحاظ سے) جرأت سے مختلف ہے ۔

جرأت نے معاملات عشق پر آزادانہ لکھا ہے ، اور رندی و
شاہدبازی کے خارجی احوال پر خاص توجہ کی ہے ۔ مومن نے
بھی معاملات عشق بیان کیے ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ مومن نے
لکھنو کی خارجیت پر دہلی کی متانت کا رنگ چڑھا دیا ہے اور ظاہر
ہے کہ یہ فرق معمولی فرق نہیں ۔ جناب امداد امام اثر نے غلط
نہیں لکھا کہ '' اس پر بھی جوانانہ انداز کے ساتھ تہذیب کی عنان
کبھی ہاتھ سے نہیں دیتے ۔''

تہذیب کی عنان کو تھامنے کی خاطر یا اس کی مجبوری سے مومن نے رمزی اور کنائی پیرایہ اختیار کیا تاکہ جو بات کہی جائے اس میں رکھ رکھاؤ اور پردہ باقی رہے ۔ یہی پردہ داری اور بے پردگی مومن اور جرأت کے مابین ایک حد فاصل ہے ۔

بس کہ اک پردہ نشیں کے عشق میں ہے گفتگو
بات بھی کرتے نہیں جز صنعت ایہام ہم

مومن کی شاعری کا پر لطف حصہ وہی ہے جس میں انہوں نے عاشقانہ معاملات کو رمزی پیرائے میں بیان کیا ہے ۔ انہوں نے حسن کی ستائش اکثر کی ہے مگر دل پر گزرنے والی کیفیتوں کی ترجمانی سے بھی قلم کو روکا نہیں ۔ خارجی کوائف حسن و عشق کا بیان اور داخلی تاثر کی ہلکی ہلکی چاشنی اور اس کے لیے رمزی پیرایہ ان تینوں عناصر کے امتزاج سے مومن کی شاعری میں ایک مستقل شخصیت نمودار ہوتی ہے ۔

مومن کی شاعری میں زلف و رخ ، قد و گیسو اور سرمہ و حنا کا ذکر بہت ہے ۔ رنگینیوں کے اس ہجوم میں خوش دلی اور شادابی کی لہر قدرتی طور پر ابھری ہوتی ہے ۔ مگر گاہے گاہے قفس و آشیاں کے غم کی بھی ہلکی ہلکی خلش محسوس ہوتی ہے ۔ بے نصیبی کا گلہ اور شکایت ستم آسماں ہماری شاعری کا ایک عام مضمون ہے لیکن مومن کے یہاں یہ مضمون محض رسمی معلوم نہیں ہوتا ، اس میں کچھ اصابت بھی دکھائی دیتی ہے ۔ غم کی تعمیری اہمیت اور ناگزیر حیثیت کسی مخلص شاعر (یا مخلص انسان) سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی ۔ غم و شادی زندگی میں باہم دست بدست چلتے ہیں لیکن خوش دلی کے مسلک میں غم کی اہمیت کچھ اور بھی بڑھ جاتی ہے ۔ غم نہ ہو تو سینے ویران محلوں کی مانند بے رونق اور بے رنگ ہو جائیں ، زندگی کے باغ کے لیے غم کی آبیاری لازمی ہے ۔

مومن کے کلام میں غم کی کیفیت ایک لطیف احتجاج اور ایک شکایت رنگین کا درجہ رکھتی ہے :

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

مومن کے کلام میں شکایت رنگیں کی جو صورت ہے اس میں شدید افسردگی اور اضمحلال کی چبھن نہیں ۔ مومن کے قلم کی نوک یوں بھی گہری نہیں جاتی ؛ چناں چہ ، فلسفہ و فکر کا کوئی رنگ ان کے یہاں نہیں ۔ ہماری شاعری کو تصوف نے جو فکری رنگ عطا کیا ہے ، مومن کے کلام میں وہ فکری رنگ بھی نہیں ۔ ان کا کلام ان کی اختراعی ذہانت کے نمونے پیش کرتا ہے مگر تجزیۂ حقائق کی شکلیں بہت کم ہیں اور وہ چیز بھی بطور خاص موجود نہیں جسے سماجی شعور کہا جاتا ہے ۔ مومن کے کلام میں بلاشبہ مذہبی عقیدوں کا ذکر ہے اور اس کے تحت اس جہاد کے اشارے بھی ہیں جو ان کے مرشد حضرت سید احمد بریلوی کر رہے تھے ۔ مگر یہ بھی مذہبی عقیدے کی ایک شکل ہے ۔ اس طرح کا (خواہ بدلی ہوئی صورت میں کیوں نہ ہو) سماجی شعور اردو کے ہر شاعر کے کلام میں کم و بیش مل جاتا ہے ۔ وہ بھر پور سماجی شعور جو سماج کے گہرے حقائق کی معرفت سے ابھرا ہو اور گہرے طور پر محسوس کیا گیا ہو ، مومن کے کلام میں موجود نہیں ، البتہ مذہبی احساس نمایاں نظر آتا ہے ۔ کسی واقعے کی طرف سرسری اشارے کو سماجی شعور نہیں کہا جا سکتا کیونکہ بھرپور سماجی شعور ساری اجتماعی زندگی کے مطالعہ و تجربہ سے ابھرا کرتا ہے جس سے اجتماعی نفسیات کے راز آشکارا ہوتے ہیں ۔ مومن کے یہاں

اجتماعی زندگی کا یہ تصور موجود نہیں -

ان سب باتوں کے باوجود مومن کی انفرادیت سے انکار نہیں ہو سکتا - وہ ایک منفرد شخصیت رکھتے تھے اور انھیں اپنی شخصیت کو ممتاز رکھنے کا احساس بھی تھا - اس کا ثبوت ان کے وہ اشعار ھیں جن میں انھوں نے اپنی شاعری کی خود تعریف کی ھے - تفاخر کی رسم ھمارے ادب میں کوئی نئی رسم نہیں - جاھلی عربوں کے فخریہ اشعار سے لے کر غالب تک اکثر شاعروں نے تعلی کی ھے - مگر بعض جگہ یہ تعلی زیب دیتی ھے اور بعض جگہ بری معلوم ھوتی ھے - پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تعلی بے سبب ھوتی ھے - کم از کم مومن کے معاملے میں یہ محسوس ھوتا ھے کہ اس کے گہرے اسباب ھیں اور ان میں سے ایک یہ بھی ھے کہ انھیں اپنی انفرادت کو محفوظ کرنے کے لیے ایک مستحکم قلعے کی ضروت تھی - بہت سے علوم و فنون کا ماھر : طب ، نجوم ، جفر ، رمل ، موسیقی اور عربی فارسی کا اچھا خاصا علم اپنی ذھانت اور طبیعت داری کے ساتھ صف عام میں کس طرح بیٹھ سکتا تھا انھیں اس صف سے بلند ھونے کے لیے جدا امتیازات کی ضرورت تھی - قلعۂ شاھی ذوق کے ھاتھ میں تھا ، فارسی کی اقلیم غالب نے سنبھال رکھی تھی - مومن کی جستجو نے ان کے لیے ایک اور راستہ تجویز کیا ، یعنی دلی کی شاعری میں رنگ لکھنو کی نمود - ایک الگ اور انوکھا انداز بیان جس میں فارسیت بھی اپنا نقش جمانے ھوئے ھے اور محاورۂ دھلی بھی کہیں کہیں جھانک رھا ھے - جب اس طرز بیان میں لکھی ھوئی غزل مشاعرے میں پہنچتی ھوگی تو سنانے والا (مومن) واقعی دوسرے شاعروں سے برتر نہ سہی ، الگ الگ معلوم ھوتا ھوگا - چنانچہ آزاد نے شہادت دی ھے :

''رنگین طبع ، رنگین مزاج ، خوش لباس ! کشیدہ قامت ، سبزہ

رنگ ، سر پر لمبے گھونگر والے بال ، اور ہر وقت انگلیوں سے ان میں کنگھی کرتے رہتے تھے ۔ میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا ۔ ایسی دردناک آواز میں دل پذیر ترنم سے پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا ۔ اللہ اللہ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے ۔ باتیں کہانیاں ہو گئیں ۔''

گھونگر والے بال ، دردناک آواز ، دل پذیر ترنم ، عشق و عاشقی کی عام باتوں کا ذکر جن کا ذوق ہر فرد بشر کو ہے ، اور اس پر وہ چونکا دینے والا انداز بیان کہ ہر شخص سوچنے پر مجبور ہو اور جلد مطلب کو بھی پا لے ، یہ سب باتیں مومن کی شخصیت کے الگ تشخص کے لیے کافی تھیں ، اور ان ہی کی بنا پر وہ اس دور کی بڑی بڑی شخصیتوں میں مقام حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوئے اور جب محمد حسین آزاد نے انھیں نظر انداز کرنا چاہا تو وہ نظر انداز نہ کیے جا سکے ۔

اب انداز بیان کی بات سنیے ۔ دہلی کے دور دوم کی شاعری پر شاہ نصیر کے علاوہ لکھنؤ کے شعرا خصوصاً امام بخش ناسخ کے طرز کلام نے خاص اثر ڈالا ۔ شاہ نصیر نے لفظوں کی موسیقی اور ردیفوں کی جھنکار سے ذوق کو خاص طور سے متاثر کیا ۔ مومن اور ذوق کا مزاج مختلف تھا ، پھر بھی شاہ نصیر کی چند دن کی شاگردی کا کچھ نہ کچھ اثر ہوا ۔ شاید ''تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' کی طرح کی ردیفیں ان ہی کے اثر کا نتیجہ ہیں ۔ مومن پر ناسخ کا نصیر سے بھی زیادہ اثر ہوا ۔ ناسخ کی مضمون آفرینی اور رعب دار طرز بیان سے غالب بھی عرصے تک مرعوب رہے ۔ مومن کے طرز بیان میں بھی ناسخ کے اثرات ابھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں ۔ مگر ان اثرات کو مومن کے مزاج نے اپنا رنگ بخش دیا ہے ۔ دہلی

کے ماحول کے اس دور میں ایک اور چیز بھی سامنے آئی ؛ وہ تھی زبان کی شستگی اور روزمرہ کی صفائی ۔ یہی زبان ذوق کی دھلی میں مقبول ہوئی ۔ ذوق کی شاعری کو کوئی کچھ ہی کہے ، ان کی زبان کو سبھی شاعر (غالب و مومن بھی) تسلیم کرنے پر مجبور تھے ۔ مومن پر یہ اثر بھی ہے ، اگرچہ یہ ان کا مابہ الامتیاز نہیں ۔ مگر یہاں بھی وہ مرعوب ہو کر نہیں چلے ۔ اپنا رنگ برقرار رہا ہے ۔

مومن کے طرز کلام میں یہ ساری لہریں ملی جلی نظر آتی ہیں ۔ مولوی ضیاء احمد بدایونی لکھتے ہیں : ”غزل میں نازک خیالی ، معاملہ بندی اور سوز و گداز میں مومن اپنے تمام معاصرین میں فائق ہیں“۔ مگر یہ مضمون آفرینی ہے کیا ؟ یہ ایک طرز سخن ہے جس کے ذریعے شاعر ایسے مضامین گھڑتے ہیں جو حقیقت سے یا تو بالکل خارج ہوں یا اس سے دور ترین فاصلے پر ہوں ۔ یہ طرز سخن فارسی شاعری میں بھی ایک زمانے میں مقبول رہا ہے ۔ اس مضمون کی بنیاد مبالغے پر رکھی جاتی تھی ۔ کسی استعارے کے کسی ایک پہلو کو مد نظر رکھ کر ایسا مضمون پیدا کیا جاتا تھا کہ مضمون حقیقت کی حد سے بہت دور جا نکلتا تھا ، بلکہ بعض اوقات حقیقت کی ضد بن جاتا تھا ۔ اردو شاعروں میں ناسخ کی شاعری میں حقیقت سے دوری کی حد بہت دور چلی گئی ہے ۔

مضمون آفرینی اور معنی یابی کا ھندوستان میں فارسی کے چند شعرا نے بہت چرچا کیا ۔ جلال ، اسیر اور شوکت بخاری کے مبالغے جب ناصر علی سرھندی تک پہنچے تو بات کا سمجھنا محال ہو گیا ۔ حقیقت کی تصویر الٹی بھی لٹکا دی جاتی تو کوئی مضایقہ نہ تھا ، یہاں تو یہ کوشش کی گئی کہ عجیب الخلقت پیکروں کی تخلیق کی جائے جو زندگی میں کسی طور پہچانے ہی نہ جائیں ۔ یہ روش بیدل

کے کلام میں ایک اور صورت میں نمودار ہوئی یعنی مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ دقت آفرینی ۔ پہلے تو عبارت سمجھنی مشکل تھی ، اب مطلب بھی لاینحل ہو گیا ۔ بیدل کے یہاں جوش زندگی نے کچھ سہارا دیا اور مطالب کے اظہار کے لیے ترکیب تراشی کا فن بھی انھیں آتا تھا ، اس لیے وہ بچ گئے ، باقی لوگوں کی شاعری محض گورکھ دھندا بن گئی ۔

یہ سارے اسالیب مومن کی دلی میں لوگوں کو مرعوب کیے ہوئے تھے ۔ ان سب کا مقصد کلام کو غیر معمولی بنانا تھا اور یہ سب اظہار سے زیادہ اخفا کے وسیلے تھے ۔ اب رہے مومن ، اگر غور کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کے یہاں مضمون آفرینی اور نازک خیالی کی قبیح صورتیں بہت کم ہیں ۔ ناسخ اور بیدل کے رنگ کا امتزاج غالب کے یہاں بھی ایک نمایاں خصوصیت پیدا کرتا ہے مگر غالب اس کی قباحتوں سے مغلوب نہیں ہوئے ۔ مومن کے کلام میں بھی یہ بہت کم ہوتا ہے کہ مضمون حقیقت سے بہت دور چلا جائے یا حقیقت سراسر منقلب ہو جائے ۔ ان کے یہاں اخفا کی ہر کوشش لطافت اظہار کا کوئی پہلو لیے ہوئے ہے ۔

مومن کے طرز سخن کو مضمون آفرینی اور نازک خیالی جیسی اصطلاحوں کی مدد سے متعارف کرانا بہت سی غلط فہمیوں کا باعث ہوا ہے ۔ مومن کے طرز کی ایک خصوصیت جو کبھی خرابی بھی بن جاتی ہے ، یہ ہے کہ وہ خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں کہ قاری کی ذہانت کے لیے اس میں تھوڑا بہت چیلنج ضرور ہوتا ہے ۔ وہ بات کو چھپا کر ظاہر کرتے ہیں ۔ کبھی حذف سے ، کبھی پیچ سے ، کبھی نقیض سے ، کبھی متضاد حقیقتوں کو بیان کرکے ، کبھی اشاروں اور رمزوں میں ، کبھی کنایے کے استعمال

ہے ، غرض مضمون ادا کرنے کا طریقہ براہ راست نہیں ، اس میں کچھ نہ کچھ پیچا پیچی ضرور ہوتی ہے ؛ اور کچھ نہ ہوا تو فارسی ترکیبوں سے اور ان میں مسلسل اضافتیں لا کر ہی بیان میں رعب یا غرابت کا اثر پیدا کرتے ہیں ۔ ایک عام صورت یہ ہے کہ مضمون کی کچھ کڑیاں محذوف ہوتی ہیں ۔ سرسری طور سے پڑھنے والے کو پہلی مرتبہ پڑھنے سے بسا اوقات شعر عجیب سا معلوم ہوتا ہے مگر شعری لوازم کی جن لوگوں کو تربیت حاصل ہے وہ بہت آسانی سے تھوڑے ہی تامل سے شعر کے مفہوم تک رسائی حاصل کر لیتے ہیں ۔ مثلاً اس شعر میں :

جیب درست لائق لطف و کرم نہیں
ناصح کی دوستی بھی عداوت سے کم نہیں

———

راز نہاں زبان اغیار تک نہ پہنچا
کیا ایک بھی ہمارا خط یار تک نہ پہنچا

مضمون واضح ہے لیکن اس میں ایک خلا ہے جس کو پر کرنے کے لیے پرپیچ طریقہ اختیار کیا گیا ہے ۔ اس سے کہیں ابہام کی قبیح صورتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں ، لیکن ایسے اشعار شاذ ہوں گے جن میں حقیقت کو مسخ کیا گیا ہو ۔

اس بنا پر میری رائے یہ ہے کہ مومن کے اس طریقے کو ان پرانی اصطلاحوں (مضمون آفرینی ، معنی یابی وغیرہ) کے ذریعے سے ظاہر نہ کیا جائے تو مناسب ہوگا ، اس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے ۔

آسانی کی خاطر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مومن لطیف ابہام اور رمز و اشارے سے کام لے کر اپنی اختراعی ذہانت کا ثبوت دیتے ہیں اور دوسری طرف قارئین کی ذہانت کا بھی ہلکا سا (اور انبساط بخش) امتحان لے لیتے ہیں —— ذہانت کی یہ آزمائش پڑھنے

والے کو مزہ دے جاتی ہے۔ مضمون حقیقت سے دور بھی نہیں ہوتا۔ حقیقت کا چہرہ دکھانے کے لیے قاری کو چونکا کر انبساط خیز تعجب میں ڈال دینے اور بالآخر ذوق کی پوری تشفی کرنے کی تکنیک مومن کی غزل میں بہت لطف دیتی ہے اور یہ ان کا ذہنی اور ذوق معمول معلوم ہوتا ہے۔ ذوق و غالب کی ہم عصری میں مومن نے اپنے لیے امتیاز کی یہ صورت پیدا کر لی تھی جس کی وجہ سے وہ واقعی اپنے ان نامور معاصرین سے جدا پہچانے جاتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ مومن کا امتیاز ان کی فارسی ترکیبوں کی وجہ سے ہے مگر اردو شاعری کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ فارسی ترکیبیں پہلی مرتبہ صرف مومن ہی نے استعمال نہیں کیں، یہ سلسلہ تو ابتدا سے ــــــ ولی سے بلکہ ان سے بھی پہلے سے جاری ہوا۔ میر تقی میر، مصحفی، آتش وغیرہ سب نے فارسی ترکیبوں کو اپنے بیان میں جگہ دی ــــــ مومن نے اگر فارسی ترکیبیں استعمال کیں تو اوروں سے کوئی الگ کام نہیں کیا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ مومن نے ترکیبوں کے پرانے سرمائے پر انحصار نہیں رکھا، مطلب کو ادا کرنے کے لیے نئی ترکیبیں بھی تخلیق کیں۔ ان میں سے بعض تو زمین شعر میں بہت اچھی طرح پیوست ہوتی ہیں مگر بعض اچھی طرح جمی ہوئی معلوم نہیں ہوتیں۔ جو اچھی طرح پیوست نہیں ہوتیں ان کی وجہ سے شعر صوتی طور پر ناہموار اور ناگوار سا ہو جاتا ہے۔ مگر مومن کی نظر صورت پر نہیں، غرابت پر ہے اور مومن کی تخلیقی استعداد کا یہ خاصا ہے کہ وہ غرابت کی جستجو میں رہتی ہے۔ یہ جستجو ہر قسم کے اشعار میں موجود نظر آتی ہے۔ ہاں سطح پر ان کی غزل میں بیان کی کئی شکلیں ہو جاتی ہیں۔ بعض اشعار صاف ہوتے ہیں، بعض میں پیچ ہوتا ہے، کہیں زبان مشکل اور کہیں صاف و سادہ ہوتی ہے۔

بعض اشعار میں رمز کا استعمال ہوتا ہے یعنی پردے سے بات کہتے ہیں ۔ یعنی کہتے بھی ہیں اور چھپاتے بھی ہیں ۔ بعض موقعوں پر مطلب کچھ ہوتا ہے مگر بظاہر خلاف کہہ رہے ہوتے ہیں ۔ بعض شعروں میں بیان بہت فارسی زدہ ہو جاتا ہے جو اچھا نہیں لگتا ۔ سادہ اشعار کچھ اس طرح کے ہیں :

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
رنج راحت فزا نہیں ہوتا

بے وفا کہنے کی شکایت ہے
تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا

ذکر اغیار سے ہوا معلوم
حرف ناصح برا نہیں ہوتا

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس نے کیا جانے کیا کیا لے کر
دل کسی کام کا نہیں ہوتا

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

———

جن اشعار میں کچھ کہتے اور کچھ چھپاتے ہیں ، ان کی مثالیں یہ ہیں :

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم
کہیں پامال سر نہ ہو جائے

———

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

———

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں
اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

———

فارسی زدہ بیان کی مثال یہ ہے :

اشک واژونہ اثر باعث صد جوش ہوا
ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا
جلوہ افزائی رخ کے لیے مے نوش ہوا
میں کبھی آپ میں آیا تو وہ بے ہوش ہوا!
کیا یہ پیغام بر غیر ہے اے مرغ چمن
خندہ زن باد بہاری سے وہ گل گوش ہوا
وہ ہے خالی تو یہ خالی یہ بھرے تو وہ بھرے
کاسۂ عمر عدو حلقۂ آغوش ہوا

———

غلط کہ صانع کو ہو گوارا خراش انگشت ہائے نازک
جواب خط کی امید رکھتے جو قول جف القلم نہ ہوتا

———

دل سختیوں سے آئی طبیعت میں نازکی
صبر و تحمل قلق جاں نہیں رہا
غش ہیں کہ بے دماغ ہیں گل پیرہن نمط
از بس دماغ عطر گریباں نہیں رہا
آنکھیں نہ بدلیں شوخ نظر کیونکہ اب کہ میں
مفتون لطف نرگس فتاں نہیں رہا
ہر لحظہ مہر جلووں سے ہیں چشم پوشیاں
آئینہ زار دیدۂ حیراں نہیں رہا

ان آخری اشعار کو پڑھ کر یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ

مومن کا بیان فارسی زدہ ہے مگر فارسی زدگی کے باوجود غزل پریشاں کن نہیں ۔ اس کی سطح ایسی ہے کہ معمولی سی استعداد والا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے ۔ بیان میں فارسی کی یہ کثرت اور اضافتوں کا یہ تسلسل مومن کے عجزاظہار کی علامت نہیں ۔ یہ حربہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ قاری مرعوب بھی ہو اور محظوظ بھی ۔ مقصد محظوظ کر دینے والی چونکاھٹ اور غرابت پیدا کرنا ہے ۔ غرض غرابت کی یہ جستجو مومن کے ذوق و ذہن کی خاص چیز معلوم ہوتی ہے ، مگر اغلاق و ابہام اور دقت کے سارے چرچے کے باوجود مومن کے مضمون تک پہنچنا اتنا مشکل نہیں جتنا خیال کر لیا گیا ہے ۔ اگرچہ یہ بھی غلط نہیں کہ وہ بعض اوقات اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں اور کچھ اس طرح کے شعر لکھنے لگ جاتے ہیں :

سرشک اعتراض عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا

اس شعر پر غالب کے ابتدائی کلام کا گمان ہوتا ہے ۔ یا یہ شعر :

العطش زن سپہر و یار و عدو
بے گنہ خوں مرا سبیل ہوا

اس قسم کے اشعار مرعوب تو کرتے ہیں مگر بے مزہ اور ناھموار ہیں ۔

مومن کے طرز بیان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے ، اس سے مومن کے خصائص اظہار کا شمار مقصود تھا ، مگر یہ باتیں وہ نہیں جن سے مومن کو قبول عام نصیب ہوا ۔ مومن کا چرچا ان کے اس خاص پیرایۂ بیان کی وجہ سے ہوا جس میں خفا اور رمز کی کوئی نہ کوئی صورت ہے ۔ عام توقع اور مسلمات کے برعکس کسی ایسی حالت یا نتیجے یا سبب کا بیان جس کی طرف عرف ،

عقلی اور منطقی طور پر ذہن منتقل نہیں ہوتا ، انکار کے اندر سے اقرار کا رنگ اور اقرار کے اندر سے انکار کی صورت ، نفی سے اثبات اور اثبات سے نفی کی کیفیت پیدا کرنا اور کہنے میں بہت کچھ چھپا جانا ، جن اشعار مین اس قسم کا انداز اختیار کیا گیا ہے وہی مقبول ہوئے ہیں اور انھی سے مومن کی شاعرانہ حیثیت الگ ہوئی ہے ۔ اس کے ثبوت میں طویل مثالوں کی گنجائش نہیں ، صرف ایک ہی غزل کافی ہوگی :

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
اس بت کے لیے میں ہوس حور سے گزرا
اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو
چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح
طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو
ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے
کم طالعی عاشق جاں باز تو دیکھو
مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی اٹھے وہ
بدنامیٔ عشاق کا اعزاز تو دیکھو
محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ہے پنہاں نہ رہے راز تو دیکھو
اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
دیں پاکیٔ دامن کی گواہی مرے آنسو
اس یوسف بے درد کا اعجاز تو دیکھو
جنت میں بھی مومن نہ ملا ہائے بتوں سے
جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

غزل کا شعر نمبر ۱ ، ۴ اور ۵ خاص طور سے ملاحظہ ہوں ۔ ان اشعار میں غیر متوقع صورت حال سے تعجب انگیز نتیجے نکالے گئے ہیں ۔ عقلی لحاظ سے کچھ اور ہونا چاہیے تھا مگر ہوا کچھ اور ۔ ساتویں شعر میں حقیقت اشیا میں انقلاب پیدا کر کے تان کو جو سننے سے تعلق رکھتی ہے ، ایک دیکھی جانے والی (مرئی) کیفیت بنا دیا ہے ۔ تخیل اس نقشے کو دو سطحوں سے دیکھتا ہے ۔۔ ادھر آواز ہے اور آدھر شعلہ۔۔۔ تخیل اپنی طاسمی قوت سے آنکھ اور کان کے فاصلے مٹا دیتا ہے ، آنکھ کو آواز میں بھی تماشے نظر آ رہے ہیں اور کان کو شعلہ بھی گویا سنائی دے رہا ہے ۔ تخیل کی یہ کارفرمائی حواس کی قلمرو میں وسعتیں پیدا کر رہی ہے اور اس سے تاثر کی دنیا میں جو ہلچل پیدا ہو سکتی ہے وہ واضح ہے ۔ شاعری اگر غیر مرئی اور مجرد کو مرئی اور محسوس بنا کر نہ دکھا سکے تو وہ ہے کس کام کی ۔

مومن کے یہاں اثر آفرینی کی جو صورتیں بھی ہیں ان میں ان کی ردیف کا بھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے ۔ غزل کی شاعری میں ردیف سے جو اثر پیدا کیے جاتے ہیں ، عام طور سے ان کی اہمیت نظر انداز کر دی جاتی ہے لیکن مختلف شعرا کے غزلیہ کلام میں اگر ردیف کی تکنیک کا مطالعہ کیا جائے تو بڑے شعرا کے یہاں اس کا الگ الگ نباہ ان میں سے ہر ایک ذہن و ذوق کے الگ الگ رحجانات کا راز کھول سکتا ہے ، لیکن یہ مطالعہ محنت طلب ہے اور ممکن ہے کہ بعض اوقات گمراہ کن بھی ہو: پھر بھی ردیف کی تکنیک کا مطالعہ فائدے سے خالی نہیں ہوگا ۔

مومن پر شاہ نصیر کا تھوڑا بہت اثر ضرور پڑا ہے ۔ ان کی غزل میں لمبی ردیفیں شاید اسی اثر کی یادگار ہیں ۔ ان میں غزل جس کی ردیف ''تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'' بہت مشہور ہے اور عام طور سے ماجرائے عشق کے راست اظہار کی وجہ سے دور جدید

میں پسند بھی کی جاتی ہے ۔ لیکن یہ مومن کے اصل رنگ کی نمائندگی نہیں کرتی ۔ مومن ان شاعروں میں سے ہیں جو محض لفظوں کے صوتی تکرار سے اثر پیدا کرنا کافی نہیں سمجھتے ۔ جو شاعر بیان میں رمز و اخفا کو اظہار کا وسیلہ بنا رہا ہو وہ بھلا اس قدر عام اور پامال اور کھلے طریقے سے اثر آفرینی پر کیسے آ سکتا ہے ۔ مومن صوت سے زیادہ مطلب اور طریق ادا پر انحصار رکھتے ہیں ، اس لیے ماسوا چند غزلوں کے ان کے یہاں دھما چوکڑی مچانے والی ردیفیں کم ہیں ۔ ان کی ردیفیں نسبتاً مختصر اور معنی خیز ہوتی ہیں ، ''معنی خیز'' سے میری مراد یہ ہے کہ وہ غزل کے موڈ کے اظہار میں بہ لحاظ الفاظ (نہ کہ بہ لحاظ صوت) ممد و معاون بنتی ہیں ۔

ردیف واؤ کی چند ردیفیں مع قوافی ملاحظہ ہوں :

سرمگیں آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو
خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

خاک اڑاتے کیوں ہو ، جلاتے کیوں ہو ، ستاتے کیوں ہو ، دھوم مچاتے کیوں ہو ، بات بناتے کیوں ہو ۔ وغیرہ وغیرہ

(ردیفوں کا طرز خطاب اور اس پر سوالیہ انداز غزل کی معنوی فضا میں وحدت پیدا کر رہا ہے اور اس کی تکرار سے تسلسل کا احساس ابھرتا ہے) ۔

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو

ستم ناز تو دیکھو ، آغاز تو دیکھو ، چشم فسوں ساز تو دیکھو ، وغیرہ وغیرہ ۔

(غزل میں 'تو دیکھو' کا ٹکڑا اور طرز تخاطب کتنا چونکا دینے والا ہے ۔ وہ تخیل کو اس کی لاعلمی کا طعنہ دے کر اس کے سامنے انکشاف کا ایک نیا میدان لے آتا ہے ۔ اس میں طعن و طنز کی ہلکی سی نوک بھی ہے جو صرف چبھتی ہی نہیں ، چبھن کا حیرت انگیز اور

احتجاج خیز اثر بھی پیدا کر رہی ہے)

یہ مایوسی ، دل و جاں ! نالۂ شب‌گیر تو کھینچو
کھنچے گا اس کا دل آہ فسوں تاثیر تو کھینچو

سب سے پہلے ''یہ مایوسی'' کا تعجب انگیز سوالیہ ، اس کے بعد ''نالۂ شبگیر تو کھینچو'' کا خطاب دل و جاں سے، اس میں معانی کی ایک دنیا آباد ہے ۔ پھر اسی زمین میں ردیفوں کی تکرار مثلاً تم شمشیر تو کھینچو

شمیم گل کے نقاشو بھلا تصویر تو کھینچو
کھچے گا ہاتھ سینے سے تم اپنا تیر تو کھینچو

(کتنے غضب کی ردیف ہے ۔ ''تو کھینچو'' کے ٹکڑے میں دعوت ، چیلنج ، احتجاج ، ہمت افزائی ، للکار ، طنز ، رس ، زہر ، نوک خار اور نوک سوزن سب کچھ ہے ۔ یہ بے ہمتی کے خلاف مہمیز بھی ہے اور دعوت جنگ بھی) ۔

ردیف کی حکایت لمبی ہوتی جاتی ہے اور مجھے یقین بھی نہیں کہ میرا طریق استدلال تشفی بخش بھی ہے یا نہیں ۔ پھر بھی میرا خیال ہے کہ مومن کی ردیفوں سے (اور شاید ہر شاعر کی ردیفوں سے) اس عام یا خاص موڈ کا اظہار ہوتا ہے جس کے تحت وہ شاعری کر رہا ہوتا ہے ۔ مومن کی بعض غزلیات کی ردیفوں میں لفظ نہیں سلبی ملان کو ظاہر کرتا ہے ۔ طنز کا پیرایہ اور استفہام انکاری ان کے تشکیکی رجحان فکر کا بھی پتا دیتا ہے ۔ ایسی غزلوں کی خاصی تعداد ہے جن میں منفیانہ پیرائے ہیں ۔ ان سے کوئی قطعی نتیجہ نکالنا تو مشکل ہے مگر دبی ہوئی تلخی کا احساس ہوتا ہے جس پر خوش دلی کا پردہ پڑا ہوا نظر آتا ہے ، اندر اللہ جانے کیا ہے ! واسوخت لکھنے والے شاعر کے اندر کیا ہوتا ہے ، یہ بھی خدا کو معلوم ہے مگر دبی ہوئی تلخی کا ہونا قرین قیاس ہے ۔

یہ تو تھی ردیفوں کی چھپی ہوئی ''تہ موج'' مگر ظاہر میں تھوڑی سی کوشش سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ شاعر ردیفوں کی مدد سے غزل کی وحدت اور اس کے اندر کی لہر کے تسلسل کا پورا انتظام کر رہا ہے ۔ یہ چیز اکثر غزلوں میں ہے اور اس کے لیے مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ۔

مومن جھولتی ہوئی اور جھومتی ہوئی بحروں کے بھی زیادہ دل دادہ نہیں ۔ وجہ یہی ہے کہ وہ محض صوتی اثرات میں زیادہ اعتقاد نہیں رکھتے ، نہ ان کے ذہن کو اتنی فرصت ہے کہ لمبی بحروں کی تاب لا سکیں ۔ عام طور سے متوسط طول کے افاعیل تفاعیل سے غزل بنا کر اس میں اپنے رنگ خاص کا مزاج اور مزاج خاص کا رنگ پیدا کر لیتے ہیں ۔ لیکن مشاعروں کے مقابلے میں اور ہم طرحی غزلوں کے امتحان عام میں ایسی زمینوں میں بھی طبع آزمائی کرنی پڑ جاتی ہے جو شاعر کے مزاج اصلی کے مطابق نہیں ہوتیں ۔ یہ ہے رسم و رواج کا اثر اور زمانے کے عام ذوق کا اثر ۔ اس لحاظ سے مومن نے بھی جھومتی اور جھولتی بحروں میں غزلیں لکھی ہیں ، اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں ۔ اس سلسلے کی ایک غزل وہ ہے جس کا مطلع یہ ہے :

صفحۂ جیحوں پر جو کبھی ہم سوزش دل لکھواتے ہیں
سارے حباب لب دریا تبخالے سے بن جاتے ہیں

اس غزل کے چند اور اشعار پڑھیے :

آ چکے کل تم جھوٹ ہے ایسی باتوں میں ہم کب آتے ہیں
اس سے کہو جو تم کو نہ جانے آپ کسے فرماتے ہیں
سوزش دل جب کہتے ہیں تب آنسو وہ بھر لاتے ہیں
موم کی مانند آتش غم سے پتھر کو پگھلاتے ہیں
کیا کہیں تم سے اے ہم دردو پوچھو مت مرغان چمن

کیوں کر یاں ایام خزاں اور ہجر کے دن کٹ جاتے ہیں
کنج قفس میں بیٹھ کے گاہے روتے ہیں تنہائی پر
یاد سیر موسم گل سے گاہے جی بہلاتے ہیں
شام سے اپنے سو رہے وہ تو اور ہم ان کے کوچے میں
ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا پھرتے ہیں گھبراتے ہیں
کیا کسی بت کے دل میں جگہ کی کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرت مومن اب تمھیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

مومن پر میر کا عکس بہت کم پڑا ہے مگر اس غزل میں عموماً جو راست بیان، سچے جذبات اور عام فہم سادہ زبان موجود ہے اس بنا پر اس غزل کو میر کے سلسلے کی چیز کہا جا سکتا ہے۔ یوں اردو کا کون سا شاعر ہوگا جو میر کے سامنے سر جھکا کر نہیں چلا۔ مگر ان اثرات کا بیان خلط مبحث کا باعث ہوگا اور مومن کے امتیازات سے ہم بہت دور جا پڑیں گے۔

مومن نے اپیل پیدا کرنے کے لیے جو مختلف طریقے اختیار کیے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ اپنے تخلص کے استعمال میں تعجب انگیزی کے ذریعے لطف کا پہلو پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً:

دشمن مومن رہے یہ بت سدا
مجھ سے میرے نام نے یہ کیا کیا

———

ہرگز نہ رام وہ صنم سنگ دل ہوا
مومن ہزار حیف کہ ایماں گیا عبث

———

بت خانے سے نہ کعبے کی تکلیف دو ہمیں
مومن بس اب معاف کہ یاں جی بہل گیا

———

فارسی میں کہا ہے :

مومن ز دیں ملاف بہ پیشم کہ آگہم
ایمان سپردۂ بت زاھد فریب را

ـــــــ

مرد مومن دیدہ بر روئے صنم
برد با خود نیکیِ انجام را

ـــــــ

مومن کا رتبہ اردو شاعری میں کیا ہے ؟ جواب سہل ہے مگر اھل نقد و نظر کی آرا نے مسئلے کو مشکل بنا دیا ہے ۔

غالب نے ایک شعر (تم میرے پاس ہوتے ہو گویا) سن کر کہا ''کاش مومن خان میرا سارا دیوان لے لیتا اور صرف یہ شعر مجھ کو دے دیتا'' (حالی : یاد گار غالب)

''شاعری دون مرتبۂ اوست ـــ سحر رابہ مرتبہ اعجاز رسانیدہ''۔ (گلشن بے خار) ''فنون نظم میں خدا نے ان کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے استاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے'' (کریم الدین) ۔ ''اشعار ان کے مضامین پیچیدہ اور نازک خیالیوں اور نادر ترکیبوں کے ساتھ درد و غم سے معمور ہیں'' (عرش گیاوی) ۔ ''اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دے دو اور باقی سب اٹھا کر لے جاؤ ۔'' (نیاز ، نگار ، مومن نمبر) ۔

ان آرا کو انصاف کی نظر سے اور ذوق دیانت داری کے اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ ان میں بےجا محبت کا مظاھرہ ہوا ہے ۔ ہماری عام عادت ہے کہ ہم جس شاعر کے بارے میں کچھ لکھ رہے ہوتے ہیں اس سے ایسی محبت کرنے لگتے ہیں کہ اس کی

تعریف میں مبالغہ کرنا ضروری خیال کرتے ہیں ۔ اس کو سب سے بڑا شاعر نہیں تو بہت بڑا شاعر ضرور قرار دیتے ہیں ۔ یہ درست کہ خواہ مخواہ کیڑے نکالنے کی عادت بھی اچھی نہیں مگر اعزاز بلا استحقاق بھی تو مناسب نہیں ۔

مومن کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اگر دوسرے درجے کے شاعر نہ تھے تو اول درجے کے شاعر بھی نہ تھے ۔ اول درجے کی شاعری کے لیے چند اوصاف ضروری ہیں ، مثلاً یہ کہ وہ مضمون کے لحاظ سے آفاقی اقدار کی حامل ہو، پھر یہ کہ وہ وسیع انسانیت کے کسی پیغام کی ترجمان ہو ، یہ بھی کہ وہ قلب انسانی کے متعلق ہمارے علم میں اضافہ کرتی ہو پھر وہ ایک ایسے اسلوب میں پیش کی گئی ہو جو اپنی حسن کاری کے باوجود براہ راست اپیل رکھتا ہو اور آرزوے تخلیق کے بے ساختہ جذبے کے سوا کسی خارجی غرض سے متاثر نہ ہو ۔

کلام مومن میں یہ باتیں کہاں تک موجود ہیں ؟ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ مومن کی شاعری میں خلوص موجود ہے ، یعنی انہوں نے جو کچھ محسوس کیا اسی کو ظاہر کیا اور اس حد تک وہ مقبول بھی ہوئے ۔ انہوں نے خاص تجربات کا بیان اس طریقے سے کیا ہے کہ اپیل میں ایک عمومیت پیدا ہو گئی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان کے کلام میں اپیل کی بڑی وجہ ایک خاص پیرایۂ بیان ہے ، نہ کہ انکشاف ۔ وہ اس پیرایۂ بیان کی وجہ سے ممتاز ہیں ورنہ کوئی خاص بڑے حقائق — جذباتی یا فکری — ان کے کلام میں موجود نہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ کوئی شاعر محض پیرایۂ بیان کے بل بولتے پر —— یا درد ناک آواز میں اپنی غزل سنا کر —— بڑا شاعر نہیں بن سکتا ۔ وہ مقبول ہو سکتا ہے مگر بڑا نہیں ہو سکتا ۔

یہ بھی ممکن تھا کہ مومن اپنی شاعری میں غزل میں ان مذہبی تجربات کا رنگ پیدا کر دیتے جن سے متاثر ہو کر انھوں نے "مثنوی جہادیہ" لکھی لیکن اس دعوے کے باوجود کہ:

مومن نے ہر زمین کو مسجد بنا دیا

ان کی غزل میں مسجد کی تعمیر ہوئی نہیں۔ اگر وہ سچ مچ مسجد تعمیر کرتے تو عاشقی اور مجاہدی کا عجیب و غریب آمیزہ ان کی شاعری میں پیدا ہو جاتا اور ان کی شاعری، اقبال کی پیش روی کا فریضہ انجام دیتی۔ ان کے یہاں زیادہ سے زیادہ یہ ہوا کہ نیکی اور خوش وقتی کا اجتماع ہو سکا۔ اس کے علاوہ مومن کے انداز بیان میں جہاں چند باتیں دل کو اچھی لگتی ہیں، وہاں فارسی کی ثقیل ترکیبیں اور کلام کے الجھاوے ذوق پر گراں بھی گزرتے ہیں۔ اچھے بھی لگتے ہیں تو تاثیر کی بنا پر نہیں۔ اس کمزوری کی وجہ سے اچھے اشعار والی غزل بھی اکثر اوقات اپیل سے قاصر رہتی ہے۔

اس رائے کے باوجود مومن کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ اول درجے کے شاعروں کا ذکر ہو اور ہم ان میں مومن کا نام نہ لیں۔ مومن کو ہم چھوڑنا بھی چاہیں تو وہ بزور اپنا حق ہم سے منوا لیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مومن کی شاعری سچ بولنے والوں کی شاعری ہے۔ مثنویات کی سادہ کہانیاں بے تکلف کہانیاں ہیں مگر سچائی ان میں بھی ہے۔ مثنویوں کو زبردستی سے ناول یا کوئی باقاعدہ قصہ نہیں بنایا، ان میں سیدھی سادی باتیں ہیں، مثلاً یہ کہ عاشقی کی، چھپ چھپ کر ملے، راز کھل گیا، رسوائی ہوئی وغیرہ وغیرہ۔ باقی رہی غزل سو اس میں بھی سچائی ہے، اس کے علاوہ عاشقی اور تہذیب کا سمجھوتا ہے۔ مومن نے لکھنو کا رنگ اختیار کرکے یہ

ثابت کیا کہ محبت کے خارجی مضامین بھی تہذیب و متانت کے ساتھ بیان کیے جا سکتے ہیں ۔ پھر ان مضامین کو ادا اس طرح کیا ہے کہ ہر پڑھنے والا انوکھے انداز کی جانب متوجہ ضرور ہوتا ہے اور متوجہ ہونے کے بعد محظوظ بھی ضرور ہوتا ہے ۔ عاشق اور معشوق کی دنیا کی بعض عادتوں اور رویوں کا ایسا بیان ہے جو ایام جوانی کے علاوہ اس زمانے میں بھی بھلا معلوم ہوتا ہے جب پڑھنے والا جوانی سے گزر کر یاد ایام جوانی کی منزل میں ہوتا ہے ۔ جب تک پڑھنے والوں کی دنیا ان جذبوں سے متاثر ہوتی رہے گی اس وقت تک مومن کی غزل بھی دلچسپی سے پڑھی جاتی رہے گی ۔

مگر صرف اس بنیاد پر ہم انہیں اول درجے کے شاعروں میں رکھ نہیں سکتے ، اگرچہ یہ بھی ممکن نہیں کہ ہم انہیں صرف دوسرے درجے کا شاعر کہہ کر ٹال دیں ۔ مسجد گری ہوئی بھی ہو تب بھی احترام کے بغیر چارہ نہیں ۔ اسی الجھن کی وجہ سے ان کی رتبہ شناسی کے معاملے میں اہل نقد و نظر کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے ۔ محمد حسین آزاد نے از خود انہیں آب حیات میں جگہ نہ دی ، لوگوں کے اصرار پر انہیں آب حیات میں جگہ ملی ۔ جدید تر زمانے کے لوگوں میں اس کا یہ رد عمل ہوا ہے کہ وہ مومن کو بہت اونچی صف میں بٹھانے پر تلے ہوئے ہیں ۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ وہ اپنے مجموعی کارنامے کے لحاظ سے دوسرے درجے کے شاعر ہیں لیکن اگر کوئی اول درجے کے شاعروں میں بھی انہیں بٹھا دے تو اس پر کچھ زیادہ اعتراض نہ ہوگا ۔

(ڈاکٹر) سید عبداللہ

یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور

انتخاب

دیوانِ مومن مع شرح

مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی

انتخاب

دیوانِ مومن

(مع شرح)

رئیس المتغزلین حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی

مرتبہ

ظہیر احمد صدیقی بدایونی، ایم اے (علیگ)
شعبۂ اردو۔ دہلی کالج۔ دہلی

ناشر
سرسید بک ڈپو پوسٹ نمبر ۲ علی گڑھ

۱۹۵۸ء

کتاب : انتخاب دیوان مومن (مع شرح)

مرتبہ: ظہیر احمد صدیقی دلّی کالج دہلی

قیمت: دس روپے Rs.

Rs. 15/-

ناشر: سرسید بکڈپو، پوسٹ نمبر ۲۔ علی گڑھ

باہتمام مسعود حسن صدیقی محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں چھپی

دیباچہ

زندہ قوموں کا خاصہ ہے کہ اپنی قومی روایات کو زندہ و تابندہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب بنی عباس کے دور میں عربوں کے قدیم ادبی سرمایہ کو جمع کرنے کا خیال آیا تو بعض ادیبوں نے عربی حروف تہجی کی رعایت سے ہر ہر قافیہ کی نثر و نظمیں جو صندوق سینہ میں محفوظ تھیں صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیں، یورپ اور امریکہ کو اپنے ادب کی بقا اور ترقی میں جس قدر انہماک ہے، اہل علم سے پوشیدہ نہیں ایک انگریز جنرل کا قول ہے کہ میں شکسپیر کے ڈراموں کو سلطنت کی فرمانروائی پر ترجیح دیتا ہوں غرض ہر قوم اپنے ادب اور ادیبوں کا نام روشن کرنا اپنے لئے سرمایۂ افتخار جانتی ہے۔ اس کے برخلاف ہم لوگوں کو اپنے ادب سے جس قدر لگاؤ ہے اس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اُردو کے متعدد مشاہیر شعراء کے شاہکار اب تک یا تو بازار میں دستیاب نہیں ہوتے یا اگر ہوتے ہیں تو صحت اور نفاست سے معرا ہیں۔

حکیم مومن خاں مومن بھی ان باکمال شعراء میں ہیں جو مدتوں کس مپرسی کا شکار رہے شکر ہے کہ تھوڑے عرصہ سے ہمارے اہل قلم کو یہ خیال آیا کہ مومن کا قرض جو حامیان اُردو کے ذمہ ہے مع سود ادا کیا جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں بعض عمدہ اور مفید اقدامات ہو رہے ہیں۔

حال میں میرے محترم بزرگ سید ظہیر الدین صاحب علوی استاد شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی و رجسٹرار جامعہ اردو علیگڈھ نے مجھ سے خواہش کی کہ میں مومن کی ان غزلوں کی شرح کر دوں جو امتحان ادیب کامل جامعہ اُردو کے لئے منظور کی گئی ہیں، چنانچہ میں نے مندرجہ بالا جذبہ کے تحت امتثال امر کا وعدہ کر لیا۔ جو شکر ہے آج ایفا ہو رہا ہے۔ اشعار کی شرح کرنے میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ مطلب آسان اور عام فہم ہو اور غیر ضروری اختصار یا طوالت سے کام نہ لیا جائے۔ آخر میں مجھے کمال منت پذیری کے ساتھ اس امر کا اعتراف ہے کہ اس شرح کی تیاری میں بڑی حد تک حضرت قبلہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی کی شرح دیوان مومن سے مدد لی ہے مجھے امید ہے کہ میری یہ ناچیز کوشش طلباء اور اساتذہ کی محفل میں پیرایۂ قبول پائیگی۔

نیاز کیش ظہیر احمد صدیقی

دہلی ۵۸-۱-۲۰

مقدمہ

مومنؔ کی شخصیت اور شاعری کے متعلق کچھ لکھنا بہت دشوار ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اوّل تو ان کی زندگی کے واقعات جن کو ہر شخص دُہراتا چلا آیا ہے ان کو دُہرانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا دوسرے ان کی شاعری کے حدود میں اتنی وسعت نہیں کہ اس میں نئے نئے موضوعات کا اضافہ کیا جا سکے۔ ان سب سے بڑھ کر مومن کی شخصیت اور شاعری میں اتنی متضاد چیزیں یکجا ہو گئیں ہیں کہ ان کے متعلق فیصلہ کرنا دشوار ہے اگر وہ ایک طرف رند شاہد باز اور صاحب جیسی بہت سی کافراداؤں کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر تھے تو دوسری طرف شاہ عبدالعزیزؒ کے حلقہ ارادت کے ایک سرگرم رکن تھے اگر ایک طرف عشق و محبت کی راہ میں اپنے آپ کو فنا فی المحبوب کیے ہوئے تھے تو دوسری طرف جذبۂ جہاد دل میں موجیں مار رہا تھا۔ اگر وہ علوم دنیاوی کے عالم اور علوم دینی کے فاضل تھے تو یہ بھی واقعہ ہے کہ انھوں نے ان سے کوئی کام نہ لیا۔ یہی حال ان کی شاعری کا تھا۔ اگر ایک طرف آج تک لوگ ان کی مشکل پسندی کا رونا رو رہے ہیں تو دوسری طرف غالبؔ ان کی سادگی پر اپنا دیوان لُٹا دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف وہ معشوق کی خاطر کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل جانے کو آمادہ ہیں تو دوسری طرف دَیر سے بیزار ہو کر مسجد کا قصد کرتے ہیں۔ ان کی شب بتکدے میں گزرتی ہے تو دن

خانقاہ میں۔ تاہم جس امر پر تقریباً تمام تذکرہ نگار اور ناقد متفق ہیں وہ انکی عظمت ہے۔ مگر شاعر کی عظمت کو منوانے کے لئے اس کے ماحول، زندگی اور شاعری سب کا جائزہ لینا پڑتا ہے اور یہ تینوں آپس میں اس قدر ملی جلی ہیں کہ ان کو ایکدوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ شاعر کی زندگی اور ماحول سے اس کی شاعری کا ایوان تعمیر ہوتا ہے۔ اور ادب کی یہ ایک بہت بڑی بدقسمتی ہے کہ اس نے آجتک مومن پر اس حد تک توجہ نہیں کی جس کے وہ مستحق تھے۔ شرح دیوان مومن مرتبہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب اور "نگار" (مومن نمبر) کے سوا ان کے متعلق کوئی تفصیلی جائزہ نہیں ملتا۔ آج ہم چاہتے ہیں کہ مومن کی زندگی اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیں اور شعراء اردو میں ان کا درجہ متعین کریں۔ ہمیں اعتراف ہے کہ یہ جائزہ مفصل نہ ہوگا تاہم کوشش کی جائے گی کہ ان کی زندگی اور شاعری کے خاص خاص پہلو مختصر طور پر سامنے آجائیں۔

مومن شرفائے کشمیر سے تھے۔ ان کے بزرگوں میں دو بھائی شاہ عالم کے دربار سے منسلک ہوئے چونکہ یہ دونوں فن طبابت میں ماہر تھے اس لئے بہت جلد شاہی دربار میں امتیاز حاصل کیا اور خدمات کے صلہ میں ایک بڑی جاگیر کے مستحق قرار پائے۔ مگر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار رقتدار ہوا تو یہ جاگیر چھن گئی تاہم ان کے ورثا کے نام ایک قلیل رقم مقرر ہوگئی جو بعد کو مومن کو بھی ملتی رہی۔ وہ اقتدار شان و شوکت تو جاتی رہی تھی تاہم سابق آن بان آخر وقت تک قائم رہی۔ مومن کے حصہ میں دولت تو کم آئی مگر امارت کی خوبو اور شان استغنا آئی جس کو انھوں نے مدۃ العمر نباہا۔

۱۲۱۵ھ میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلاں میں مومن پیدا ہوئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رح نے آکر کان میں آذان دی اور مومن نام رکھا۔ خدا کی عنایت اور

شاہ صاحب کی برکت تھوڑے ہی عرصہ میں مومن مختلف علوم میں سرآمد روزگار ہوئے۔ اوّل قدیم گھرانوں کے رواج کے مطابق انھوں نے گھر پر تعلیم حاصل کی۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو حضرت شاہ عبدالقادر صاحب کے حلقۂ درس میں شریک ہونے لگے۔ مومن کے مذہبی رجحان میں دراصل اسی ماحول کو دخل ہے۔

جب تعلیم سے فراغ ہوا تو باپ اور چچا سے طب سیکھی۔ طب کے ساتھ ساتھ علم نجوم و ہیئت کی طرف بھی طبیعت مائل ہوئی اور ان میں بھی وہ کمال بہم پہونچایا کہ ماہرین فن کو اعتراف کرنا پڑا۔ خود مومن کو بھی اس کا احساس ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوز سینۂ بلبل   نظارۂ رخ گل خام سے مجھے محسوس

ہیئت کے متعلق ان کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے

کہاں ہے بدر سیا وہ ترحسم   کہ ہوں میں رازدانِ سیر انجم

محمد حسین آزاد کا بیان ہے کہ

"ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی، اس میں ایسا ملکہ بہم پہونچایا کہ احکام سُن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے۔"

چنانچہ مومن کے علم نجوم کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔ مومن کے کمال فن کو دیکھ کر مولانا فضل حق کہا کرتے تھے :۔

"مومن بھیڑیا ہے، اس کو اپنی قوت کی خبر نہیں، اگر وہ عشق و عاشقی کے قصوں کو چھوڑ کر علمی مشغلے میں پڑتا تو اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی۔"

طب و ہیئت کے علاوہ ریاضی۔ موسیقی۔ رمل۔ جفر۔ شطرنج اور جو سر میں بھی مہارت حاصل کی۔ ریاضی میں خواجہ نصیر کے علاوہ دلّی میں کوئی ان کا ہم پلّہ نہ تھا

موسیقی اور ہیئت میں کوئی ان کی ٹکر کا نہ تھا۔ مگر جوانی کی ہوسناکیوں نے ان کو علوم کی طرف پورے طور پر متوجہ نہ ہونے دیا۔ صاحب اور دوسری غارتگران ایمان کی محبت نے مومن کو بالکل ناکارہ کر دیا اور ان کے تمام کمالات پر پردہ ڈال دیا اور دنیا والوں کو وہ صرف ایک شاہد باز اور ایک شاعر کی حیثیت سے یاد رہے۔

کہا جاتا ہے کہ راکھ میں دبی ہوئی چنگاریوں کو افسردہ نہ سمجھو کبھی نہ کبھی وہ اپنا اثر دکھاتی ہیں چنانچہ خاندان ولی اللہی کی تربیت نے آہستہ آہستہ اپنا اثر کرنا شروع کیا اور انھوں نے شاہد بازانہ زندگی سے تائب ہو کر مذہبی زندگی اختیار کرلی۔ مگر اپنی اس نئی زندگی میں وہ زاہد خشک نہ تھے۔ ظرافت شگفتگی۔ زندہ دلی اور خوش اخلاقی ان کی طبیعت کا وصف تھی۔ خودداری اور استغنا کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی کے آستانہ پر سر نہیں جھکایا۔ نوکری کو ہمیشہ غلامی خیال کیا۔ چنانچہ جب ان کو دلی کالج کی ملازمت پیش کی گئی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ غالب عمر بھر امراء اور حکام کی مدح میں رطب اللسان رہے مگر مومن نے ہمیشہ اپنے ہی آستانہ کو خاک مراد سمجھا! انسانی تشکیل میں مذہب کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ اگر مذہبی کردار نہیں تو کبھی انسان ترقی کے اعلیٰ مدارج طے نہیں کر سکتا۔ زندگی کے ہر ہر قدم پر اس کی اہمیت اور ضرورت مسلّم ہے۔ مومن کے کان میں سب سے پہلے جو آواز پڑی تھی وہ ایک مذہبی اعلان تھا اور جس شخص کی آواز تھی، اس کے تقدس کی قسم ملائکہ بھی کھا سکتے ہیں۔ مگر اس مذہبی کردار کی تشکیل کا آغاز حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کی مجلس وعظ اور حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے مدرسہ سے ہوتا ہے۔ شاہ صاحبؒ کے وعظ اور درس و تدریس کے علاوہ حضرت شاہ اسمٰعیل رح کی صحبتیں ایسی نہ تھیں جو صدا بصحرا ثابت ہوتیں۔ گو ان کا اثر دیر میں ہوا مگر ہوا تو پورے شد و مد کے ساتھ ہوا چنانچہ

جب حضرت سید احمدؒ بریلوی کی تحریکِ جہاد شروع ہوئی تو اگرچہ مومن عملی حیثیت سے شرکت نہ کر سکے، لیکن دلی جذبات کی ترجمانی زبان نے کی ؎

تو اپنی عنایت سے توفیق دے　　عروج شہید اور صدیق دے

•

یہ دعوت ہو مقبول درگاہ میں　　مری جاں فدا ہو تری راہ میں

اسی مذہب کا اثر تھا کہ وہ اہلِ حدیث کے مسلک کے قائل تھے اور دوسرے فرقوں (احناف اور شیعہ) پر مذہبی نکتہ چینی کر جاتے تھے، لیکن بزرگانِ دین سے محبت اور عقیدت کو انھوں نے ہمیشہ جزوِ ایمان سمجھا۔ چنانچہ ان کے قصائد میں جو نعت و منقبت ہے اس سے ان کے جوشِ ارادت کا پتہ چلتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے ایک روایت لکھی ہے کہ

" نواب مصطفٰے خاں شیفتہ نے ایک مرتبہ خواب دیکھا کہ کسی قاصد نے ان کے ہاتھ میں ایک لفافہ دیا جس پر مہر ثبت تھی "مومن جنتی" خط کا مضمون یہ تھا کہ میرے اہل و عیال تکلیف میں ہیں ان کی خبر لو۔ نواب صاحب نے صبح کو مومن کے گھر پر خواب کہلوا بھیجا اور کچھ رقم روانہ کی۔ مومن کے صاحبزادے نے اعتراف کیا کہ اس زمانہ میں واقعی ہم کو بڑی مالی پریشانی تھی۔"

مومن کے حلیہ کے متعلق مرزا فرحت اللہ بیگ نے یادگار مشاعرہ میں بڑی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ آیئے مومن کی تصویر انہی کی زبانی سنیئے :-

"حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً چالیس سال کی تھی۔ کشیدہ قامت سُرخ و سفید رنگ تھا جس میں سبزی جھلکتی تھی۔ بڑی بڑی روشن آنکھیں ستواں ناک۔ پتلے پتلے ہونٹ۔ ان پر پان کا لاکھا جما ہوا

مسی آلودہ دانت۔ ہلکی ہلکی مونچھیں خشخشی داڑھی بھری بھرے ڈنڈ۔ پتلی کمر۔ چوڑا سینہ اور لمبی لمبی انگلیاں۔ سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال کاکلوں کی شکل میں۔ کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔"

مومن کے لباس کے متعلق بھی مرزا صاحب سے ہی سنیئے:

"بدن پر شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا اسکے نیچے کرتا نہ تھا اور جسم کا کچھ حصہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ۔ اسمیں چھوٹا سا سنہری تعویذ۔ کا کریزی رنگ کے دوپٹہ کو بل دیکر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اسکے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں پتلا سا خار پشت۔ پاؤں میں سرخ گلبدن کا پاجامہ مہریوں پر سے تنگ اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا۔ کبھی کبھی ایک بر کا پاجامہ بھی پہنتے تھے کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا چوڑا سرخ نیفہ۔ انگرکھے کی آستین آگے سے کٹی ہوئی کبھی لٹکتی رہتی تھی کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی اسکے کنارے پر باریک لیس۔ ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر ٹھیک طرح منڈھ کر آ گئی تھی۔"

آیئے مکین کے حلیہ اور لباس کے ساتھ اسکے مکان کی بھی سیر مرزا صاحب کے ساتھ ہی کرتے چلیں

"حکیم آغا خاں کے کوچہ کے سامنے خانصاحب کا مکان تھا۔ بڑا دروازہ ہے۔ اندر بہت وسیع صحن اور اسکے چاروں طرف عمارت ہے دو طرف صحنچیاں ہیں، اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالانوں میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا ہے۔

قالین پر گاؤ تکیہ سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مؤدب دوزانو بیٹھے ہیں معلوم ہوتا ہے کوئی دربار لگا ہے۔

مومن نے اپنے معروف ہم عصروں غالب اور ذوق سے بہت پہلے وفات پائی۔ عمر کچھ زیادہ نہ ہوئی کل ۵۳ سال اس دنیا میں رہ کر سفر آخرت کیا۔ چنانچہ ۱۲۶۸ھ میں کوٹھے پر گر جانے کی وجہ سے انتقال کیا۔ "دست و بازو شکست" خود تاریخ وفات کہی۔ غالب نے ان کے مرنے پر یہ رباعی لکھی :-

وقت است کہ روئے دل خراشم ہمہ عمر | خونابہٗ دل ز دیدہ پاشم ہمہ عمر
کافر باشم اگر بہ مرگ مومن | چوں کعبہ سیہ پوش نباشم ہمہ عمر

دوسرے معاصر اساتذہ کے برخلاف مومن کی کلیات میں ہر صنف شاعری کے نمونے ملیں گے۔ قصیدہ۔ غزل۔ مثنوی۔ واسوخت۔ مرثیہ۔ رباعی۔ قطعہ وغیرہ۔ مگر جس صنف میں انھوں نے شہرت پائی وہ غزل ہے، اور غزل میں بھی ان کا موضوع صرف حسن و عشق رہا۔ فلسفہ۔ تصوف۔ اخلاق کے میدان سے بچتے ہوئے انھوں نے محبت کی رنگین مگر پرپیچ راہ پسند کی۔ معاملات حسن و عشق۔ معشوق، اور عاشق کے تعلقات۔ رقیب اور ناصح سے نوک جھونک۔ وصل و ہجر کی کیفیات غرض یہ دائرہ ہے جس کے گرد مومن کی شاعری گھومتی ہے۔ دائرہ اتنا وسیع نہیں جتنا عمیق ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مومن کے یہاں معشوق کا حسن اتنا نمایاں نہیں ہے جتنا ان کے الفاظ کا حسن۔ ان کے جذبات اتنے پیچیدہ نہیں۔ جتنے خیالات۔ اور یہی خیالات کبھی کبھی معمہ بن جاتے ہیں۔ مگر جب جذبات کی شدت ان کے خیالات پر حاوی ہو جاتی ہے تو مشکل پسند شاعر کے یہاں سہل ممتنع کی وہ مثالیں دیکھنے میں آتی ہیں کہ جن پر ذوق سلیم کو ایمان لانا پڑتا ہے۔

مومن کی شاعری نے جس فضا میں آنکھ کھولی۔ وہ شاہ نصیر اور ناسخ کے

نغموں سے گونج رہی تھی ۔ غالب ۔ ذوق اور ان کے دوسرے ہم عصر انکی تقلید کر رہے تھے ۔ پھر مومن کیوں کر اس سے دامن بچا سکتے تھے ۔ مومن کے اس دور میں نہ تو خیال کی کوئی لطافت نظر آتی ہے اور نہ انداز کی کوئی خوبی ۔ یہ تقلید کا دور تقلیدی اعتبار سے بھی زیادہ کامیاب نہیں کہا جا سکتا ۔ اس کی اول تو وجہ یہ ہے کہ ناسخ کے کلام میں وہ جان نہ تھی کہ ان کا مقلد اپنے لئے کوئی مقام پیدا کر سکتا ۔ دوسرے مومن کے ذہن کی کش مکش ہر تقلید سے بغاوت کرتی تھی ، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ زیادہ عرصہ تک اس جال میں پھنسے رہتے چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت جلد اس کوچہ سے نکل آئے ۔ تقلیدی دور کی چند جھلکیاں ملاحظہ ہوں :-

یاد آنا سوئے دشمن اس کا جانا گرم گرم
پانی ، پانی ہو گیا میں موج دریا دیکھکر

تاش کا ہمدم کفن لانا کہ بس میں مرگیا
چلو نوں سے جلوۂ خورشید سیا دیکھکر

ظلم کا ثمرہ یہی تھا دیکھ کر گلہائے داغ
بید مجنوں شرم سے وہ سرو رعنا ہو گیا

وہ گردن دیکھ یہ حالت ہوئی تغیر سر شیشہ کی
کہ تھمتی ہی نہیں ہچکی ہوئی ہے دیر شیشہ کی

لکھ کے بدمستیٔ غم ، تا کہ وہ میکش پڑھ لے
باندھ دیتا ہوں سر شیشہ صہبا کاغذ

بن ترے لے شعلہ رو آتشکدہ تن ہو گیا
شمع قد پر میرے پروانہ برہمن ہو گیا

جب اس کوچہ سے نکلے تو اپنی سلامت طبع کو اپنا رہبر بنایا ۔ غالب نے

جب رنگ ناسخ ترک کیا تو میر کا کوچہ اختیار کیا۔ مگر جب مومن نے اس میدان کو چھوڑا تو اپنے لئے کسی تقلیدی رنگ کو پسند نہ کیا اور سچ تو یہ ہے کہ خواہ ان کا دائرہ مختصر سہی مگر اس میں جو نئی نئی راہیں انھوں نے پیدا کیں وہ صرف ان ہی کا حصہ ہیں۔ ان کی نازک خیالی کے متعلق حالی کو اعتراف ہے کہ اس وصف میں وہ مرزا سے آگے تھے۔ مومن کی زندگی کا بڑا حصہ عشق و عاشقی میں گذرا۔ اس لئے انھوں نے شاعری میں بھی یہی میدان پسند کیا۔ پوری اردو شاعری میں صرف مومن ہی کی ذات ایسی ہے جس نے خالص تغزل کو اپنایا اور اس میں اپنے انداز بیان کی ندرت سے نئے نئے رنگ بھرے۔

انھوں نے نہ تو رموز و تصوف سمجھائے نہ فلسفہ کی گتھیوں میں اپنے آپ کو الجھایا تصوف کی منزل سے منہ پھیر کر وہ شاہدان عشوہ فروش کے کوچوں کے چکر لگاتے ہوئے ملتے ہیں یا کسی پردہ نشین کے عشق میں سرگرداں و پریشاں نظر آتے ہیں۔ ہجر و وصال رشک و حسد، محبوب کے غمزہ و ادا۔ عاشق کی نفسیات کی عکاسی اور واردات محبت کی مصوری ان کا محبوب موضوع ہے، کبھی عاجزی کا یہ عالم کہ آستان یار پر سجدہ ریز ہیں اور کبھی معشوق سے برابری نبھاتے ہیں، ان کی محبت میں کوئی استقلال نہیں۔ ان کے عشق کا کوئی اصول نہیں، بلکہ ان کے یہاں تلون مزاجی ہے کہ جہاں حسن دیکھا وہاں مچل گئے کبھی تو یہ حال ہے۔

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

اور کبھی یہ تیور ہے

بت خانہ چھوڑ ہو اگر تیرا گھر — مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

شاعری کوئی جامد شے نہیں ہے جس کو ہم کسی خاص دائرہ میں محدود کر سکیں شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ ایک جذبہ ہے جس کی جڑیں جمالیاتی ذوق کے

اندر سے نکلی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ فکری عمل سے بھی بے نیاز نہیں، شاعری کی دنیا وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں تمام دنیا کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں، شاعر محسوسات کی دنیا سے وہ نتائج اخذ کرتا ہے جہاں سائنس کی رسائی ممکن نہیں مگر جذبہ ہو یا فکر، خلوص کے بغیر یہ شاعری کو جنم نہیں دے سکتا۔ حالی نے شاعری کے لئے جو شرط سب سے اہم لگائی ہے وہ "خلوص" ہے۔ اگر شاعری میں خلوص نہیں ہے تو اس میں تاثر پیدا نہیں ہو سکتا، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، شاعری کوئی جامد شے نہیں ہے، اس میں تجربے کرنا کوئی بری بات نہیں، بلکہ ضروری ہے۔ ہاں! اگر شاعری کے جسم پر کوئی لباس پورا نہ اترے تو خدا کے لئے اس پر اصرار نہ کیجئے۔ ہر شے کا مزاج ہوا کرتا ہے۔ شاعری کا بھی مزاج ہوتا ہے۔ جہاں تک اردو شاعری کا تعلق ہے، اس نے ہمیشہ اپنے اندر وسعت رکھی، مواد کے اعتبار سے بھی اور ہیئت کے لحاظ سے بھی۔ ذرا غور کیجئے کہ کل تک ہماری شاعری کیا تھی اور ترقی کرتے کرتے کہاں جا پہونچی۔ زبان و بیان کے جو کرشمے اردو شاعری نے دکھائے وہ اتنی سرعت کے ساتھ ہماری زندگی میں جگہ پا گئے کہ دوسری زبانیں دیکھتی رہ گئیں۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا، میں ذکر مومن اور اردو غزل کا کر رہا تھا۔

فنون لطیفہ میں شاعری کا مقام بہت بلند ہے اور شاعری کی سب سے اہم صنف غزل ہے۔ غزل کی کچھ اپنی روایات ہیں، جو مدت دراز سے چلی آرہی ہیں۔ ولی سے لے کر داغ تک ہر شخص انہی روایات کی ڈگر پر چلتا نظر آتا تھا۔ مومن پہلے شخص ہیں جنھوں نے ان فرسودہ روایات کے خلاف آواز بلند کی۔ امرد پرستی کے کوچہ سے غزل کو نکال کر ایک فطری ماحول میں داخل کیا۔ مومن کے پورے دیوان میں بجز ایک دو جگہ کے کہیں مذکر محبوب کا تصور نہیں ملے گا۔ ایک آدھ جگہ تو ضرور وہ کہہ جاتے ہیں کہ

ڈوب مریے کیوں نہ غیرت سے جب لے موتمن تہہا ئے
غیر کے ہمراہ وہ طفلِ برہمن آب میں

مگر عام طور سے ان کے یہاں ایک "پردہ نشین" کا تصور ہے، یہ پردہ نشین ہوتے کے باوجود عاشقی کا کھیل کھیلتی ہے۔ تاہم موتمن کا معیارِ عشق اتنا بلند ہے کہ اس کو بھی عام سطح سے اونچا کر دیا۔

ہجر پردہ نشیں میں مرتے ہیں زندگی پردہ در نہ ہو جائے

موتمن کے یہاں معشوق کا ذکر اس اہتمام کے ساتھ نہیں ملتا، جتنا عشق کا ذکر اس سلسلہ میں سب سے پُرلطف بات یہ ہے کہ موتمن نے عاشقانہ روایات سے بھی بغاوت کی ہے۔ پروفیسر مجنوں نے عشقیہ شاعری کے جو روایتی اصول بیان کئے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ اصل غزل وہ ہے جس کے اشعار میں عشق و محبت کی فضا چھائی ہو، جس میں سپردگی کا احساس، حمیت و خودداری کے مقابلہ میں زیادہ ہو۔

۲۔ غزل میں تعلی۔ خودبینی اور اپنی ذاتی حیثیت اور قدرت کے احساس کا اظہار نہ ہونا چاہیئے۔

۳۔ معشوق کا ادب اور اس کے ناموس کا پاس ہر حال میں ہونا چاہیئے۔

یہ اصول قدیم اُردو شاعری کے اسلوب کے لئے بہت موزوں تھے مگر موتمن کے یہاں آکر یہ تمام اصول کالعدم ہو جاتے ہیں۔ موتمن کا احساس خودی کہیں بھی اپنے آپ کو سپرد کرنے کو تیار نہیں اگر معشوق کو اپنے حسن پر ناز ہے تو عاشق کو اپنے عشق پر غرور ہے۔ جہاں وہ معشوق سے اظہارِ مطلب میں عاجزی برتتے ہیں، وہاں اس کے تغافل پر چیں بہ جبیں بھی ہوتے ہیں۔ وہ ایک

شاہانہ مزاج رکھتے ہیں اور اپنے "انا" کو کبھی نہیں بھولتے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے:-

غیر ہے بے وفا پہ تم تو کہو — ہے ارادہ نباہ کا کب تک
جرم معلوم ہے زلیخا کا — طعنۂ دست نارسا کب تک

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو — کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے

تو یہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے — وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

سنیں نہ آپ تو ہم بوالہوس سے حال کہیں — کہ سخت چاہیئے دل لینے والا زوال کیلئے

جن سے منظور وفا ہو، ہو جفا بھی ان پر — مجھ سے کچھ کام نہیں ہے تو ستاتے کیوں ہو

مومن کی شاعری میں جو پہلو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے وہ انکی نفسیاتی بصیرت ہے۔ وہ عشق و محبت کے رموز کو بڑے نفسیاتی انداز میں پیش کرتے ہیں جس میں بڑی نزاکت اور دلآویزی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں:

دن رات فکر ہو رہیں یوں رنج اٹھانا کب تلک
میں بھی ذرا آرام لوں، تم بھی ذرا آرام لو

تمہیں تقصیر اس بت کی، کہ ہے میری خطا لگتی
مسلمانو! ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی

کیا اس بت سے ڈرتا ہوں تو مومن — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

مومن کی نازک خیالی اور ندرتِ ادا کا اعتراف ہر زمانہ میں ناقدوں نے کیا ہے اور حالی نے تو نازک خیالی میں مومن کو غالب پر فوقیت دی ہے۔ بات میں بات پیدا کرنا اور اس انداز سے کہ سننے والا خواہ مخواہ چونک جائے، ندرت اسلوب ہے۔ بقول نواب امداد اثر:۔

"حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے۔ وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبع کی تماشاگاہ ہے۔"

کلیم الدین کو بھی اس کا اعتراف ہے کہ:۔

"مومن اپنے حسین خیالات کو حسین الفاظ و تراکیب کے ذریعہ ادا کرتے ہیں، طرز ادا دل کش ہے۔"

نازک خیالی کا انداز دیکھنا ہو تو یہ اشعار پڑھیے!

یہ عذر امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

رحم فلک اور مرے حال پر
تو نے کرم اے ستم آرا کیا

اک ایک ادا، سو سو دیتی ہے پیام اسکے
کیونکر لب قاصد سے پیغام ادا ہوتا

کس واسطے اے شمع زباں کاٹتے ہیں لوگ
کیا تو نے بھی کی تھی شبِ ہجراں کی شکایت

نا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں
کیوں سرگزشت تم کو بھی ہے کوہکن کی یاد

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے
صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

میں جانتا ہوں نعش پہ آنے کا مدعا
آسودگی پسند تری شوخیاں نہیں

بے اعتماد مرے بختِ خفتہ پر کیا کیا — ورگرنہ خواب کہاں چشمِ پاسباں کے لئے

اردو شاعری میں جس شاعر نے طنز کو غزل میں خاص طور پر برتا ہے وہ مومن ہیں۔ طنز جس قدر لطیف ہوگا اسی قدر مزا دے جائے گا ورنہ وہ جلے دل کے پھپولے توڑنا ہوگا، طنز نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس طنز سے شاعر کا مقصد اپنا مطلب نکالنا ہے اور اگر مطلب نکالنے میں ناکامی ہو تو پھر اس کے ذریعے دل کی بھڑاس تو نکل ہی جاتی ہے۔ جیسا شروع میں کہا جا چکا ہے، مومن نے ہمیشہ اپنے محبوب سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی ہیں، اگر اس کی طرف سے نخوت کا اظہار ہوا تو مومن بھی چیں بہ جبیں ہو گئے۔ اس عالم میں کبھی اس کو جلی کٹی سنا دیں۔ کبھی فقرے کس دیئے۔ رقیب پر طعن و تشنیع۔ محبت سے بے زاری کا اظہار۔ کبھی محبوب اور رقیب کو لڑا کر اپنا مطلب نکالنا یہ سب اس ضمن میں آتے ہیں۔ غزلوں میں زاہد اور واعظ پر طنز کی کثرت سے مثالیں ملتی ہیں۔ مگر محبوب کو اپنے طنز کا نشانہ بنانا صرف مومن کا حصہ ہے۔ اس طنز سے عاشق کا کوئی فائدہ ہو یا نہ ہو، البتہ شاعر کی "ذہانتِ طبع" اور "ذکاوتِ حس" کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ مگر یہ واضح رہے کہ مومن کا طنز ان تمام شعراء سے مختلف ہے جنھوں نے طنز کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ مومن کا طنز ان کے عشق کے گرد گھومتا ہے یہی وجہ ہے کہ مومن کا طنز غالب سے مختلف ہے۔ غالب کے طنز میں کبھی تو اس قدر بلندی پیدا ہو جاتی ہے کہ:-

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اور کبھی اس حد تک پست ہو جاتا ہے کہ "دھول دھپا" کرنے پر اتر آتے ہیں

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں — ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

یہ خیال رہے کہ اگر طنز میں ظرافت کی چاشنی قطعاً نہ ہو تو اس میں تلخی اور ناگواری پیدا ہو جائے گی۔ اور اگر ضرورت سے زیادہ یہ چاشنی آگئی تو پھکڑ پن کہلائیگی آیئے مومن کے یہاں طنزیہ اشعار کا نمونہ دیکھیں۔

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کرکے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

ہنسے ہیں ہم صیاد کے کہتا ہے کس کس کو لطف — گرچھٹے راہِ چمن لے وستگانِ دام لو

آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے — باوفا حسن و بے وفا ہے عشق

دوست کرتے ہیں ملامت، غیر کرتے ہیں گلہ — کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں

کیسے گلے رقیب کے کیا طعنِ اقربا — تیرا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

اب حال دل ہے اس بُت کے دلخواہ — کیا پوچھتے ہو؟ الحمدللہ

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب — غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب

مومن کے طنز میں بلا کی نشتریت ہے۔ اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ اس طنز سے کام نہیں چلتا تو وہ اپنے تکرِ شاعرانہ سے کام لیتے ہیں۔ بات کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر محبوب کا فائدہ معلوم ہو مگر حقیقت میں اس سے خود عاشق کا فائدہ ہوتا ہے مثلاً وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میری طرف بھی نگاہ کرم ہو، اگر یہ بھی جانتا ہے کہ اگر میں

عرض مطلب کروں گا تو ناکامی ہوگی، اس لئے وہ عجیب پیرایۂ بیان اختیار کرتا ہے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا   میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

چند مثالیں سنیے، ان کی تشریح کہاں تک کی جائے۔

۱ شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے   اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا

۲ گر ذکرِ وفا ہے یہی غصہ ہے تو اب کے   گو قتل کا وعدہ ہو تقاضا نہ کریں گے

---

۳ ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا   جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

لوگوں کو مومن کی مشکل پسندی کا رونا ہے، اس میں شک نہیں کہ مومن نے شاہراہ عام سے الگ اپنا راستہ نکالنے کی کوشش کی، اسی وجہ سے کلام میں کبھی کبھی اغلاق و تصنع پیدا ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مومن کے کلام میں کثرت سے ایسی مثالیں ملیں گی، جن کا مفہوم غور کے بعد سمجھ میں آتا ہے۔ اسی کے ساتھ تراکیب کی ناہمواری اور رعایات کی کثرت ان کے یہاں زیادہ ہے۔

کیا ناز شاد ہوں کردہ ہے تلخ کام تر   میری جو شورشوں نے نمک کو مزا دیا

کس طرح معلوم ہو حالِ دلِ گم گشتہ ہائے   جو کبوتر لے گیا واں نامہ عنقا ہو گیا

اک نگہ سے سرسری دیوانہ ہم کو کر گئی   گردشِ چشم پری رو ساحرانہ کالے تھا

زلف کی بو آئے گی ہم کو اگر   غیر کے گھر دستہ سنبل ہو گیا

بے سبب کیونکہ لبِ زخم پہ افغاں ہوگا — شورِ محشر سے بھرا اس کا نمکداں ہوگا

مرے خط میں شکایت اسکی شہبازِ نظر کی ہے — پر و بال کبوتر ایک اک لکھدوں نہ بکھریگا

غرض ان اشعار میں خیالات کی پیچیدگی اور زبان کی ناہمواری ملے گی۔ مگر جہاں انھوں نے سادگی برتی ہے، اس کا جواب نہیں ہے۔ سادگی۔ شوخی اور حسنِ ادا یہ تمام خوبیاں ان کے کلام میں کافی حد تک موجود ہیں۔ عام طور سے نقادوں نے مومن کی سادگیٔ بیان کی طرف توجہ ہی نہیں کی ورنہ اس دریا سے وہ ڈھلے آبدار برآمد ہوتے کہ ان کا مول ممکن ہی نہیں۔ چند اشعار سنیئے :-

روز کہتا تھا کہیں مرتا نہیں ہم مر گئے — اب تو خوش ہو بے وفا تیرا ہی یہ کہنا کیا

کسی کا ہوا آج، کل تھا کسی کا — نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

نامِ عشقِ بتاں نہ لو مومن — کیجئے بس خدا خدا صاحب

اثرِ غم ذرا بتا دینا — وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق

صرف سادگی ہی نہیں ان کی تشبیہات اور برجستہ محاورے بھی لطف جاتے ہیں۔ محاوروں کا اعجاز دیکھئے :-

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

مومن تم اور عشقِ بتاں اے پیر و مرشد خیر ہے — یہ ذکر اور سنہ آپ کا صاحب خدا کا نام لو

لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو — بندے کا بس سلام ہے ایسے سلام کو

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ — اے شب ہجر تیرا کالا منہ

چند تشبیہات کی رنگینی ملاحظہ ہو۔

کیا کیا شکن دیے ہیں دل زار کو مگر — اس کے خیال میں ورق انتخاب تھا

واعظ کے ذکر مہر قیامت کو کیا کہوں — عالم شب وصال کے آنکھوں میں چھا گئے

آتش آہ بے اثر سے مری — آسماں گلشن خلیل ہوا

غرض کہاں تک ان کی "سادگی و پرکاری" کی مثالیں دی جائیں۔ ان کی ایہام گوئی کے پہلو بہ پہلو سہل ممتنع کی مثالیں کثرت سے مل جائیں گی۔

میں نے شروع ہی میں عرض کیا تھا کہ مومن کی زندگی ہی نہیں بلکہ شاعری بھی مجموعۂ اضداد ہے اور یہی تضاد ہے جو کبھی ان کو مشکل پسند بنا دیتا ہے اور کبھی سہل پسند۔

میں نے کسی جگہ مومن کی علمیت کا ذکر کیا تھا کہ ان کو مختلف علوم میں دستگاہ حاصل تھی۔ ان کے اشعار میں ان علوم کی اصطلاحیں ملتی ہیں۔ مومن کی علمیت کا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

قرانِ انجم سیارہ ہے برجِ آبی میں — ڈبوئے گی مری چشم ستارہ بار مجھے

آتشِ سینہ عقیدہ کو کیا ہے روزن — و شک جانب کرۂ آب کی مائل نہ ہوا

اپنے سودے کی نہ پوچھو کہ خریدار کے ساتھ — جنس ہی تو ہے دل اور بیع سلم کرتے ہیں

ان اشعار کے ساتھ ساتھ کہیں قرآن و احادیث کے حوالے بھی پائے جاتے ہیں۔

واعظ بتوں کو خلد میں لے جائینگے کہیں
ہے وعدہ کافروں سے عذاب الیم کا

جلتا ہوں اہل نار کی تبدیل جلد سے
مومن غضب ہے آتش لذت فزائے داغ

ساتھ نہ چلنے کا بہانہ تو دیکھ
آ کے مری نعش پہ وہ رو گیا

مومن کو اپنی صلاحیتوں کا احساس تھا۔ ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ شعر و ادب میں میرا رتبہ کیا ہے، یہ احساس کبھی کبھی شعر کا جامہ پہن لیتا ہے اور ان اشعار میں خود ستائی نہیں بلکہ خود اعتمادی کی جھلک نظر آتی ہے

ایسی غزل کہی یہ کہ جھکتا ہو سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا

مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعرا کے امام کو

عبث ترقی فن کی ہوس ہے مومن کو
زیادہ ہوئیگا کیا اس سے بے مثال ہے تو

مومن کی خصوصیات کا ذکر ادھورا رہ جائے گا اگر ان کے حسن مقطع کا ذکر نہ کیا جائے۔ مقطع میں اپنے تخلص کو اس خوبی سے بٹھاتے ہیں کہ دوسرے شاعروں کو یہ بات نصیب نہیں۔ مومن کی نسبت سے کافر، بت، مسلمان، کعبہ، اور اس قبیل کے دوسرے الفاظ اس خوبی کے ساتھ لاتے ہیں، گویا یہ الفاظ اسی موقع کے لئے بنائے گئے تھے۔ تخلص کی نسبت سے دوسرے شعراء بھی فائدہ اٹھا سکتے تھے، مگر جو فائدہ مومن نے اٹھایا وہ کسی دوسرے نے نہیں اٹھایا۔ حسن مقطع کی مثال میں چند اشعار سنیئے جو صرف یادداشت کے سہارے لکھے جا رہے ہیں ورنہ ایسے اشعار کی کثرت ہے۔

اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں
ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

عرض ایمان سے صنم اس غارتگر دیں کو پڑھی
تجھ کو اے مومن خدا سمجھے یہ تو نے کیا کیا

مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ہو
کافر ہوا ہیں دین کے آداب دیکھ کر

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

دشمن مومن ہی رہے بت سدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

مومن کی عظمت اور ان کی شاعری کی لطافت اپنی جگہ اٹل ہے۔ غزل کے محدود دائرے کو انھوں نے جو وسعت عطا کی وہ نہ صرف اردو شاعری بلکہ اردو زبان کا ایک کارنامہ ہے۔ ان کی غزل کی سچائی اور مزاج نے ان کو دوسرے ہم عصر شعراء سے ممتاز کر دیا ہے۔ مگر یہ تصویر نامکمل رہے گی اگر اس کا تاریک رخ نہ دکھایا جائے۔ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی دیوان مومن کے مقدمے میں تحریر فرماتے ہیں:-

"در اصل یہ ہے کہ عرفی کی طرح مومن کی اٹھان بھی خوب ہوئی مگر افسوس کہ ترقی کا موقع نہ ملا۔ اگر ان کی عمر وفا کرتی اور ان کی مجتہدانہ ایچ دیسندی اور لاابالیانہ و رنگین مزاجی انہیں مہلت دیتی تو اس میں شک نہیں کہ اردو شاعری میں ان کا جواب نہ ہوتا۔ انھوں نے شاعری کو پیشہ کی حیثیت سے کبھی اختیار نہیں کیا۔ البتہ تفریح کی نیت سے پسند کیا اور اپنے دوسرے مشاغل کی طرح سامان دل بستگی سمجھا"

مومن کی خامیوں کی ذمہ داری مختلف قسم کے حالات و واقعات پر ہے۔ ابتدائی زمانہ میں ناسخ کی پیروی نے ان کو شاعری کے خارجی پہلو کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے علاوہ ان کی طبیعت خود پیچ و خم کی خوگر تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر و بیشتر جگہ ان کا کلام پیچیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ناقابل فہم ہو گیا ہے اور اشعار کی شرح کرتے وقت

ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی معمّہ حل کر رہے ہیں، مثلاً

نقدِ جاں تھا نہ سزائے دیتِ عاشق حیف — خونِ فرہاد بسرِ گردنِ فرہاد رہا
تیشہ کچھ دشنۂ شیریں نہیں اے غیرت — اپنے ہی خوں سے مگر دامنِ فرہاد بھرے
دیکھ اپنا حالِ زار منجم ہوا رقیب — تھا سازگار طالعِ ناساز دیکھنا
ان سے پرسش کو نہ دیکھے کوئی — مجھ کو میری شرم نے رُسوا کیا
گر یاس ہے لوگوں کا تو آجا کہ قلق سے — ہے لاش کہیں اور کہیں مدفن ہی ہمارا

(۲) زبان مشکل ہونے کے ساتھ ناہموار بھی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد میں زبان کے جو چٹخارے ذوق کے یہاں ملتے ہیں وہ کسی شاعر کے یہاں نہیں ہیں۔ مومن کے یہاں کہیں تو بندش کی خرابی اور نامانوس ترکیبوں کی بھرمار ہے اور کہیں پہلے مصرعے میں دوسرے مصرعہ کے حق کا بھی ٹکڑا لگا دیتے ہیں، مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

بے حجابی کا گلہ کیجیے تو کہتا ہے ترے — پردۂ چشم کی تقصیر کہ حائل نہ ہوا
خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ پہنچا — لبوں پہ دم بلا ہی جوشِ خونِ شوقِ شہادت کا
میں احوالِ دل مر گیا کہتے کہتے — تھکے تم نہ بس بس سنا کہتے کہتے
دفن جب خاک میں ہم سوختہ ساماں ہوں گے — فلسِ ماہی کے گل شمعِ شبستاں ہوں گے

(۳) مومن کی رنگین طبیعت نے اپنی غزل کو فلسفہ اور تصوف کے عنصر سے الگ رکھا مگر مذہبی طرز و تعریض سے دامن نہ بچا سکے۔ غزل کا کوئی مذہب نہیں ہوتا مگر مومن نے اس کو اپنے اعتقادات کا ترجمان بنایا۔

خیالِ خوابِ راحت ہے علاج اس بدگمانی کا — وہ کافر گور میں مومن مرا شانہ ہلاتا ہے

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں | مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

منہ کو مومن سے چھپانا کافر | یہ تقیہ تو نہ بھایا مجھ کو

ہم اور یہ بدعت تپش دل کے سبب سے | مومن مرے سینہ پہ رہے بعد فنا ہاتھ

ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر | ہر جائے اگر مومن موجود خدا ہوتا

۴۔ مومن کے یہاں عشق کا تصور زیادہ بلند نہیں ہے۔ ان کا عشق ہوس سے خالی نہیں ہے جس کی خاطر وہ اپنے جذبات کو بے لگام کر دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں کسی قدر بے اعتدالی کے مظاہرے بھی ملتے ہیں۔

لے شب وصل غیر بھی کاٹی | تو مجھے آزمائے گا کب تک

گئے وہ خواب سے اُٹھ غیر کے گھر آخر شب | اپنے نالے نے دکھایا یہ اثر آخر شب

میرے کوچہ میں عدو مضطر و ناشاد رہا | شب خدا جانے کہاں وہ ستم ایجاد رہا

صبحدم مہتاب کا سا رنگ کیوں ہو گر نہ تھا | بوالہوس کے پاس تو اے ناز پرور رات کو

وہ بگڑنا وصل کی رات کا وہ نہ ماننا کسی بات کا

وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

یہ چند کمزوریاں ہیں جو ان کی شاعری میں پائی جاتی ہیں۔ مگر مومن کی عدم مقبولیت میں ان باتوں کے علاوہ کچھ ماحول کی بھی کارفرمائی تھی۔ بقول حضرت ضیا بدایونی:۔

"مومن کو کوئی حالی جیسا نقاد نہ ملا جو ان کے کمالات کو اُجاگر کرتا"

خود مومن کے شاگرد شیفتہ نے اتنا نہ کیا کہ آزاد کی طرح اُستاد کے نام کو اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے۔ دوسرا سبب یہ بھی تھا کہ مومن کو درباری سے نفرت تھی۔ وہ اس سستی شہرت سے بھاگتے تھے اور اس زمانے میں کسی شاعر کا قلعہ معلیٰ سے منسلک ہونا اس کی شہرت کا خاص ذریعہ ہوتا تھا۔ خود غالب جب تک قلعہ سے منسلک

نہیں ہوئے تھے وہ شہرت حاصل نہ کر سکے، جو تعلق قائم ہونے کے بعد حاصل ہوئی تیسرے مومن کے کاروبار عشق نے بھی ان کو منظر عام پر لانے سے روکا۔ صاحب کے عشق نے ان کو کہاں کہاں کی کوچہ نوردی کرائی اور انھوں نے عشق کی دنیا سے کبھی باہر جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ چوتھے ان کی عدم مقبولیت کا سبب یہ بھی ہے کہ اس وقت ہندوستان کی عام فضا تصوف پسند تھی اور مومن کو تصوف سے کبھی لگاؤ پیدا نہ ہوا۔ مومن کے سب سے بڑے مدّاح ان کے ہمعصر شعراء ہو سکتے تھے مگر مومن اپنی انانیت کے سامنے ان کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

مومن: شاعروں کا مرے آگے رنگ تھا
حق تو یہ ہے کیا غزل اک اور مومن نے پڑھی
مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو

جوں بیٹھے آفتاب ہوئے نور تر چراغ
آج باطل سارے اُستادوں کا دعویٰ ہو گیا
جو نسبت ہم میرے اشعار تک نہ پہونچا

ان اشعار میں تعلّیاں ہیں جن کو مومن امر واقع سمجھتے تھے۔ ان کی انانیت نے دوسرے شعراء کو حقیر جانا، چنانچہ مومن نہ تو دوسرے شعراء کی تعریف کرنا پسند کرتے تھے اور نہ سننا گوارا تھا۔ بہرحال معاصرین فطرتاً ان سے خوش نہ رہ سکے

جہاں تک اس عہد کی دو ممتاز شخصیتوں مومن و غالب کے موازنے کا سوال ہے تو دونوں اپنے رنگ کے اُستاد تھے۔ مومن کا اگر کوئی جواب تھا تو غالب اور غالب کا کوئی جواب تھا تو مومن۔ ان دونوں کی سیرتوں کا موازنہ عبدالباری آسی نے بڑی خوبی سے کیا ہے۔

"غالب آزاد مزاج۔ رند۔ لاابالی۔ غم و افکار کو کیف شراب سے دور کرنے والا۔ زخم خوردہ، مگر مرہم کی جستجو سے بے پرواہ۔ زرد مند مگر فکر چارہ سے مستغنی۔ مومن عاشق۔ الفت و محبت کی مضبوط زنجیروں

میں جکڑا ہوا حسن پر جان دینے والا زمانہ کے غم و الم سے اثر لینے والا۔ آن پر جان دینے والا غالب فاقہ مست مگر مزاج شاہانہ لئے ہوئے۔ مومن شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت کا بیٹھنے والا۔ غالب امرائے عہد کا ثنا گو اور عقیدت مند۔ مومن رؤسا کی باتوں کو چین ابرو سے دیکھنے والا۔ ان کی صحبتوں سے محترز۔ ان کے مال و دولت پر نظر استحقار ڈالنے والا"

سیرتوں کا اثر شاعری پر بھی ہوا کرتا ہے۔ ایک ماحول اور زمانہ ہونے کے باوجود دونوں کا رنگ شاعری جداگانہ ہے۔

مومن نے غزل کو تغزل کے دائرے میں محدود کر دیا۔ وہ صرف حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ وہ اسی میدان میں اپنے خیالات کے گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔ ان کا میدان وسیع نہیں ہے مگر اس کی بلندی بہت ہے، اس لئے ان کو کبھی "تنگنائے غزل" کی شکایت نہیں ہوتی۔ البتہ ان کے یہاں غالب کی سی بوقلمونی نہیں ہے کہ جس زمین کو چھیڑا اس کو آسمان کر دیا۔ مومن اپنی شاعری میں نہ تو مجازی کی محبت سے تجاوز کر کے عشق حقیقی کو طلب کرتے نظر آتے ہیں اور نہ اخلاقی اقدار پر بحث کرنے میں ان کے یہاں خیالات اور جذبات اتنے مشکل نہیں جتنا ان کا پیرائیہ بیان پیچیدہ ہے۔ غالب کے یہاں فارسی ترکیبوں اور رنگ بے دل کے باعث ہیئت کے ابہام کے ساتھ معنی میں بھی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ سہل ممتنع کی عمدہ مثالیں بھی دونوں کے یہاں خوب ملتی ہیں۔ بعض جگہ غالب کے فلسفہ نے انداز بیان خشک بنا دیا ہے مگر مومن نے اس کو تغزل کے طرز میں پیش کر کے ایک عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ مگر جہاں تک ترکیبوں کا تعلق ہے دونوں نے فارسی ادب سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدائی شاعری میں دونوں پر شاہ نصیر اور ناسخ کا رنگ غالب تھا جب

نہیں ہوئے تھے وہ شہرت حاصل نہ کر سکے، جو تعلق قائم ہونے کے بعد حاصل ہوئی
تیسرے مومن کے کاروبار عشق نے بھی ان کو منظر عام پر لانے سے روکا۔ صاحب
کے عشق نے ان کو کہاں کہاں کی کوچہ نوردی کرائی اور انھوں نے عشق کی دنیا سے
کبھی باہر جھانکنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ چوتھے ان کی عدم مقبولیت کا سبب یہ بھی
ہے کہ اس وقت ہندوستان کی عام فضا تصوف پسند تھی اور مومن کو تصوف سے کبھی
لگاؤ پیدا نہ ہوا۔ مومن کے سب سے بڑے مداح ان کے ہمعصر شعراء ہو سکتے تھے
مگر مومن اپنی انانیت کے سامنے ان کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔

مومن: شاعروں کا مرے آگے رنگ
حق تو یہ ہے کیا غزل اک اور مومن نے پڑھی
مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو

جوں بہنیں آفتاب ہوئے نور تر چراغ
آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہو گیا
جو لیت ہم میرے اشعار تک نہ پہونچا

ان اشعار میں تعلیاں ہیں جن کو مومن امر واقع سمجھتے تھے۔ ان کی انانیت نے دوسرے
شعراء کو حقیر جانا، چنانچہ مومن نہ تو دوسرے شعراء کی تعریف کرنا پسند کرتے تھے اور نہ
سننا گوارا تھا۔ بہر حال معاصرین فطرتاً ان سے خوش نہ رہ سکے

جہاں تک اس عہد کی دو ممتاز شخصیتوں مومن و غالب کے موازنے کا سوال
ہے تو دونوں اپنے رنگ کے استاد تھے۔ مومن کا اگر کوئی جواب تھا تو غالب اور غالب
کا کوئی جواب تھا تو مومن۔ ان دونوں کی سیرتوں کا موازنہ عبدالباری آسی نے بڑی
خوبی سے کیا ہے۔

"غالب آزاد مزاج۔ رند۔ لاابالی۔ غم و افکار کو کیف شراب سے
دور کرنے والا۔ زخم خوردہ، مگر مرہم کی جستجو سے بے پرواہ۔ درد مند
مگر فکر چارہ سے مستغنی۔ مومن عاشق۔ الفت و محبت کی مضبوط زنجیروں

میں جکڑا ہوا حسن پر جان دینے والا زمانہ کے غم و الم سے اثر لینے والا۔ آن پر جان دینے والا غالب فاقہ مست مگر مزاج شاہانہ لئے ہوئے۔ مومن شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت کا بیٹھنے والا۔ غالب امرائے عہد کا ثنا گو اور عقیدت مند۔ مومن رؤسا کی باتوں کو چین ابرو سے دیکھنے والا۔ ان کی صحبتوں سے محترز۔ ان کے مال و دولت پر نظر استحقار ڈالنے والا۔"

سیرتوں کا اثر شاعری پر بھی ہوا کرتا ہے۔ ایک ماحول اور زمانہ ہونے کے باوجود دونوں کا رنگ شاعری جداگانہ ہے۔

مومن نے غزل کو تغزل کے دائرے میں محدود کر دیا۔ وہ صرف حسن و عشق کے شاعر ہیں۔ وہ اسی میدان میں اپنے خیالات کے گھوڑے دوڑاتے رہتے ہیں۔ ان کا میدان وسیع نہیں ہے مگر اس کی بلندی بہت ہے، اس لئے ان کو کبھی "تنگنائے غزل" کی شکایت نہیں ہوتی۔ البتہ ان کے یہاں غالب کی سی بوقلمونی نہیں ہے کہ جس زمین کو دیکھا اس کو آسمان کر دیا۔ مومن اپنی شاعری میں نہ تو مجازی کی محبت سے تجاوز کرکے عشق حقیقی کو طلب کرتے نظر آتے ہیں اور نہ اخلاقی اقدار پر بحث کرتے ہیں ان کے یہاں خیالات اور جذبات اتنے مشکل نہیں جتنا ان کا پیرائیہ بیان پیچیدہ ہے۔ غالب کے یہاں فارسی ترکیبوں اور رنگ بے دل کے باعث ہیئت کے انجماد کے ساتھ معنی میں بھی پیچیدگی نظر آتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ سہل ممتنع کی عمدہ مثالیں بھی دونوں کے یہاں خوب ملتی ہیں۔ بعض جگہ غالب کے فلسفہ نے انداز بیان خشک بنا دیا ہے مگر مومن نے اس کو تغزل کے طرز میں پیش کرکے ایک عجیب لطف پیدا کر دیا ہے۔ مگر جہاں تک ترکیبوں کا تعلق ہے دونوں نے فارسی ادب سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدائی شاعری میں دونوں پر شاہ نصیر اور ناسخ کا رنگ غالب تھا جب

اس تقلیدی دور سے نکلے تو غالب نے میر کی پیروی کی اور مومن نے خود اپنا نیا راستہ اختیار کیا۔ غالب کے کلام میں ایک تنوع ہے اور اس تنوع میں نہایت بلند مضامین ملتے ہیں۔ فلسفہ۔ تصوف۔ اخلاق۔ محبت۔ زندگی۔ موت۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے موضوعات غالب کے عنوانات ہیں، مگر مومن کا صرف ایک موضوع ہے اور وہ حسن و عشق۔ مگر اس ایک عنوان کے جس قدر پہلو ممکن ہیں مومن نے بیان کر دیئے ہیں۔ محبوب۔ رقیب۔ عاشق۔ وصال۔ ہجر۔ ان مضامین کو نئے نئے طریقوں سے بیان کیا ہے، گو عنوانات پرانے ہیں مگر انداز نیا اور انوکھا ہے۔

یہاں ہم غالب اور مومن کے کچھ اشعار پیش کریں گے جن میں بڑی حد تک خیال کی مماثلت ہے۔ اہل ذوق خوب و زشت کا خود فیصلہ کریں گے۔

مومن
پاتے تھے چین کب غم دوری سے گھر میں ہم
راحت وطن کی یاد کریں کیا سفر میں ہم

غالب
تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس جو گلخن میں نہیں

مومن ۵
ہو کے آزردہ پشیماں ہوں کہیں جس سے کہوں
وہی کہوے کوئی ایسے سے خفا ہوتا ہے

غالب ۵
رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی

مومن ۶
چھوٹ کر کہاں سیر محبت کی زندگی
ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

غالب ۶
قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

مومن ۵ کرکے زخمی مجھے نادم ہوں یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے

غالب ۶ کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

وہ اشعار جو ہم قافیہ اور ہم ردیف ہیں:

مومن خلق ہوں محو شاہد و یاد شراب میں
شوق ثواب نے مجھے ڈالا عذاب میں

غالب ۷ ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

مومن اظہار دوستی کی خوشی کیا شب وصال
دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں

غالب ۸ ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز
نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

مومن کہتے ہو تم کو ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں

غالب ۹ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مومن کہاں وہ عیش اسیری کہاں وہ کنج قفس!
ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لیے

غالب ۱۰ نشاں یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لیے

انتخاب مومن

مرتبہٗ

ظفر احمد صدیقی

شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونیورسٹی
بنارس

اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ

انتخابِ مومن

مرتبہ : ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی

پہلا ایڈیشن : ۱۹۸۳ء
تعداد : ۱۱۰۰
قیمت : چار روپے

ستیش چندر سریواستوا، سکریٹری اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے نشاط پریس
ٹانڈہ سے طبع کروا کے اکاڈمی کے دفتر سے شائع کی۔

ترتیب

مقدمہ

مومن:

حکیم محمد مومن خاں مومن دہلوی بن حکیم غلام نبی خاں ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے، اور غالب کے ایک خط بہ نام منشی نبی بخش حقیر، مورخہ یکم شعبان ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۱ر مئی ۱۸۵۲ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن نے اس تاریخ سے دس روز قبل (یعنی بہ روز چہار شنبہ، ۲۲ر رجب ۱۲۶۸ھ مطابق ۱۲ر مئی ۱۸۵۲ء کو) وفات پائی۔ موصوف ایک کشمیری، طبابت پیشہ خاندان کے چشم و چراغ تھے، جو شاہ عالم ثانی کے زمانے میں دہلی آکر آباد ہو گیا تھا۔ ابتدائی تعلیم اور حفظ قرآن کے بعد عربی درسیات کی طرف متوجہ ہوئے لیکن اس کی تکمیل نہ کر سکے۔ تاہم غالب وغیرہ کے مقابلے میں ان کی عربی استعداد بہ درجہا بہتر تھی۔ فارسی دانی میں غالب و صہبائیؔ کے ہم پلہ و ہم رتبہ تصور کیے جاتے تھے۔ طب کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اور مطب میں نسخہ نویسی بھی کرتے تھے۔ اس کے علاوہ نجوم، رمل، شطرنج اور موسیقی سے بھی شغل تھا، بلکہ ان کے ماہرین میں شمار کیے جاتے تھے۔ سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق ان کی سیرت و شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں ذکاوت و ذہانت، خوب روئی و کشیدہ قامتی، خوش وضعی و خوش لباسی، رند مشربی و عشق پیشگی، لاابالی پن اور وارستہ مزاجی جیسے عناصر کا بہت دخل رہا ہے۔ وضع داری اور عزتِ نفس کا احساس بہت زیادہ تھا، اس لیے شاعری کو ذریعۂ عزت یا وسیلۂ معاش نہیں بنایا۔ متوسط الحال تھے۔ کچھ خاندانی پنشن اور کچھ طبابت کی آمدنی گزر اوقات کا ذریعہ تھی۔ خاندانِ ولی اللہی سے نسبتِ شاگردی اور عقیدت رکھتے تھے۔ سید احمد شہید بریلویؒ کی تحریکِ جہاد سے براہِ راست متاثر ہوئے۔ مسلکاً اہلِ حدیث تھے۔ اپنے عقائد کا اظہار اور دوسروں پر تنقید جرأت اور بے باکی کے ساتھ کرتے تھے۔ تصوف اور توحید وجودی وغیرہ کے مضامین کو شعر میں بھی روا نہ رکھتے تھے۔ ۵۰ سال کی عمر میں کوٹھے سے گر کر وفات پائی۔ دیوانِ اردو، دیوانِ فارسی اور انشائے مومن ان کے علمی آثار کے طور پر موجود ہیں۔ ان کے علاوہ ان کی تصانیف کے طور پر "جانِ عروض"، "شرحِ سدیدی"، "شرح نفیسی" اور "رسالۂ خواص پان" کے بھی نام لیے جاتے ہیں۔

ان کا اب سراغ نہیں ملتا۔ کلب علی خاں فائق رام پوری نے اپنی تصنیف "مومن" میں
کے ۳۰ شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، مرزا اصغر علی خاں نسیم،
حسین تسکین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

مومن

مومن اردو شاعری میں ایک منفرد لب ولہجہ اور مخصوص انفرادیت کے مالک ہیں۔ یہ ممکن
ا کہ شعرائے اردو اور ان کے اسالیب بیان زیر بحث لائے جائیں اور مومن سے تعرض نہ کیا
ئے۔ "آب حیات" اولاً مومن کے ذکر سے خالی تھی، لیکن آزاد کو چار و ناچار اپنے طرز عمل کی
ح کرنی پڑی۔ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی انفرادیت تو داغ وحسرت بلکہ جرأت اور شاہ نصیر کو
حاصل تھی لہذا مومن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کچھ اور "وسعت بیان" کی ضرورت ہے۔
مومن کو عام طور پر نازک خیال، مضمون آفریں اور دقت پسند شاعر کی حیثیت سے پیش
تا ہے، اور یہی اوصاف ان کے مابہ الامتیاز قرار دیے جاتے ہیں، لیکن مشکل یہ ہے
اصطلاحات اس قدر مبہم، غیر واضح اور گنجلک ہیں کہ ان کی بنیاد پر معروضی تنقید کی عمارت
نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ نزاکت خیال، مضمون آفرینی اور دقت پسندی جیسے اوصاف
بت آسانی کے ساتھ غالب کے لیے بھی ثابت کیے جا سکتے ہیں، یہی حال شوخی ادا، جدت
ب اور ان جیسی دوسری اصطلاحات کا بھی ہے۔ لہذا ان کی بنیاد پر بھی مومن کے انفرادی
ہیم کی کوشش بے سود ہے۔

اصل اصول یہ ہے کہ شاعرانہ انفرادیت کی بنیادیں شاعر کے تجربات و محسوسات اور الفاظ
طریقہ استعمال پر قائم ہوتی ہیں، اور شاعر بڑا ہو یا چھوٹا، اس کے لب ولہجے کی شناخت اور
رقیت کے تعین کے لیے یہی دو پیمانے معیاری اور مثالی قرار دیے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی واضح
کہ شاعرانہ انفرادیت کے یہ دونوں عناصر فاعلیت اور انفعالیت دونوں قسم کی تاثیر رکھتے
، مراد یہ ہے کہ جس طرح تجربات و محسوسات، الفاظ کے تئیں، شاعر کے رویے کی تعیین و تحدید
تے ہیں، اس طرح الفاظ کا طریقہ استعمال تجربات و محسوسات کی نوعیت اور اس کے

دائرہ کار کو متعین و مشخص کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوا ہے کہ بظاہر یہ دونوں مختلف عناصر بھی کہیں آگے چل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ تجربات و محسوسات ہوں یا الفاظ اور ان کے برتنے کا سلیقہ و انداز، ان کی جڑیں شاعر کے اندرون میں پیوست ہوتی ہیں۔ اور اندرون عالم کا ہو یا عامی کا، شاعر کا ہو یا غیر شاعر کا۔ اقدار و روایات، افکار و معتقدات، زندگی کے بارے میں مثبت یا منفی نقطۂ نظر، خداداد یا اکتسابی صلاحیتوں، کامرانیوں اور ناکامیوں اور ان کے علاوہ صدہا شعوری و غیر شعوری عناصر سے ترکیب پاتا ہے، جن کی تعبیر و تشریح کی ذمے داری ناقد پر نہیں، ماہرِ نفسیات پر عائد ہوتی ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد ہم مومن اور کلامِ مومن کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مومن کے تجربات و محسوسات بنیادی طور پر عاشقانہ ہیں، اگرچہ اس کی مختلف سطحیں ہیں۔ پہلی سطح تو وہ ہے جہاں دل پر گزرنے والی کیفیتوں کی ترجمانی و حکایت ہی شاعر کا مطمحِ نظر ہے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

اس کوچے کی ہوا تھی، کہ میری ہی آہ تھی
کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

آہِ سحر ہماری، فلک سے پھری نہ ہو
کیسی ہوا چلی یہ، کہ جی سنسنا گیا

آپ آہ ہی کریں، کہ ہو شاید اسے تاثیر
فرصت نہیں اب، بے نفسی بار پسیں ہے

حیرتِ دیدار، بس آئینہ رکھ دے ہاتھ سے
اپنی حالت دیکھ کر، ظالم! کٹا جاتا ہے دل

جہاں ہے شکل کو تیری، ترس ترس گزرے
جو تجھ پہ بس نہ چلا، اپنے جی پہ بس گزرے

ٹکٹکی لگائی ہے، اب تو اس توقع پہ
تا، وہ گر ادھر دیکھیں، مجھ کو دیکھنا دیکھیں

بے نالہ منہ سے چھوٹتے ہیں نے گریہ آنکھ سے
اجڑے ہوئے دل کا حال نہ پوچھ، اضطراب میں

کس کی خبر آنے کی ہے، کس لیے ہے یہ بے تابی
کس لیے ہم سب ہر دم پھرتے؟ آتے ہیں جاتے ہیں

کنجِ قفس میں بیٹھ کے، گاہے ملتے ہیں، تنہائی پہ
یادِ سیرِ موسمِ گل سے، لگا ہے، جی بہلاتے ہیں

کھا گیا جی غمِ نہاں، افسوس
گھل گئی غم کے مارے جاں، افسوس

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے
جی بلا سے رہا، رہا، نہ رہا

ہم نے ان اشعار کو محض وارداتِ قلبیہ اور کوائفِ عشقیہ کا ترجمان اس لیے قرار دیا ہے کہ

ان میں تجربات و محسوسات کی بنا نہ تو منطقیانہ ترتیب مقدمات و استخراجِ نتائج پر قائم کی گئی ہے۔ نہ مسلمہ اقدار و روایات کی مخالفت یا ہم نوائی پر۔ اور نہ مناسباتِ لفظیہ و معنویہ کے مختلف حربوں کو حسن آفرینی کی فضا خلق کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ان اشعار کی لَے میر کی عشقیہ شاعری سے جا ملتی ہے، اگرچہ میر و مومن کا فرق پھر بھی واضح ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر یہ مومن کا حقیقی رنگ نہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ انھوں نے ایسے اشعار خال خال کہے ہیں، حتیٰ کہ ان کی تعداد مجموعی کلام کے عشرِ عشیر کو بھی نہیں پہنچتی۔ دوسرے اس قسم کی شاعری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جس قسم کی خاموش اور بہ جہت تفکیر نیز نامرادانہ زیست کرنے کا حوصلہ ضروری ہے۔ وہ مومن جیسے بامراد عاشق اور طرح دار نوجوان کو نصیب نہ تھا۔

مومن کی عشقیہ شاعری کی دوسری سطح وہ ہے۔ جہاں قلبی کیفیات و واردات کی ترجمانی کے بجائے، عاشقانہ حرکات و سکنات اور اعمال و افعال کے بیان کو ہی مقصودِ اصلی بنایا گیا ہے۔ اور چونکہ اس قسم کی شاعری میں "از دل خیزد بر دل ریزد" والی کیفیت کا پیدا ہونا معلوم، اس لیے مناسباتِ لفظیہ کا بھی حتی الامکان لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس طرح مل جل کر کچھ نہ کچھ اثر و تاثیر کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور ایک حد تک شعر و سخن کا لطف بھی آ جاتا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

اس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا، کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

محو مجھ سا، دمِ نظارۂ جاناں ہو گا — آئنہ، آئنہ دیکھے گا تو حیراں ہو گا

وقتِ جوشِ بحرِ گریہ، میں جو گرمِ نالہ تھا — حلقۂ گرداب، رشکِ شعلۂ جوالہ تھا

زرد منہ دکھلا دیا، غم کا اثر دکھلا دیا — آج ہم نے اس کو، اپنا زور و زر دکھلا دیا

اس کے اٹھتے ہی، ہم جہاں سے اٹھے — کیا قیامت ہے؛ جی کا آ جانا

حالِ دل، یار کو، لکھوں کیوں کر؛ — ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا

نے جلے واں بنے ہے، نہ بن جائے بن ہے — کیا کیجیے؛ ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح

بعد مدت، اس کو سے، یوں پھرے بہ تنگ آ کر — جائے جائے پھرتے ہیں، پوچھتے مکاں اپنا

شمع ساں اپنی تپش ہے، تو ہمنے یا نہ سنے — طے نہ ہووے گا یہ افسانہ، زباں ہونے تک

کیا گل کھلے گا؟ دیکھیے، ہے فصلِ گل تو دور — اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

آتا ہے خواب میں بھی تری زلف کا خیال — بے طور گھر گئے ہیں پریشانیوں میں ہم

کیا کیجیے؟ کہ طاقتِ نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں

کیا جلوے یاد آئے کہ اپنی خبر نہیں — بے بادہ مست ہوں میں شبِ ماہتاب میں

میں تو اس زلف کی بو پر غش ہوں — چارہ گر مشک سنگھاتے ہیں مجھے

پھر وہ وحشت کے خیالات ہیں سر میں پھرتے — دشت یاد آتے ہیں، آہوئیں نظر میں پھرتے

مومن کے کلام میں اس قسم کے اشعار بہ کثرت ملتے ہیں، لیکن ان کی بنیاد پر بھی مومن کا انفراد ثابت نہیں کی جاسکتی، اس لیے کہ متذکرہ بالا اشعار میں جس قسم کے اشعار نظم کیے گئے ہیں۔ نیز ان کے لیے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا گیا ہے۔ ان کی حیثیت ایک حد تک بین الشعرائی ہے۔ چنانچہ ان کی معتد بہ مثالیں بہ ادنیٰ تغیر دوسرے شاعروں کے کلام سے بھی بہ آسانی پیش کی جا سکتی ہیں۔

دراصل مومن کی شاعری کا اصل جوہر اور اس کا حقیقی رنگ وہاں کھلتا ہے۔ جب وہ ایک خاص قسم کی فضا خلق کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس کی تعبیر یوں کر سکتے ہیں کہ شاعری میں مومن کا محبوب مشغلہ حیرت افزائی و استعجاب آفرینی ہے۔ اور وہ ہمیشہ اس کوشش میں مشغول رہتے ہیں کہ سامع یا قاری کو کسی نہ کسی طرح حیرت و استعجاب میں ڈال کر خود بھی محظوظ ہوں اور اسے بھی محظوظ کریں۔ اس مقصد کے حصول کا ایک طریقہ تو وہ تھا۔ جو سبک ہندی کے فارسی گو شعرا نے عموماً اور متاخرین شعرائے فارسی ناصر علی، شوکت بخاری اور بیدل و غالب نے خصوصاً اختیار کیا تھا۔ یعنی کبھی تو خیال کی بنیاد کسی فلسفیانہ نکتے پر رکھ دی، کبھی استعارہ در استعارہ کا نظام اختیار کیا اور کبھی صوفیانہ پراسراریت سے کام لیا وغیرہ وغیرہ۔ لیکن مومن نے ان حربوں سے کام بنا پسند نہیں کیا۔ یا تو اس لیے کہ وہ اپنی راہ ان سب سے الگ نکالنا چاہتے تھے۔ اور یا اس لیے کہ متذکرہ اسالیب بیان، ان کی افتادِ طبع، انداز فکر اور معتقدات سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ بہرحال مومن نے جو طریق کار اختیار کیا ہے۔ اس کے بھی مختلف پہلو ہیں۔ ایک شکل تو یہ ہے کہ مانوس تجربات و محسوسات کے نامانوس تلازمات و انسلاکات کی طرف ذہن موڑ دیتے ہیں مثلاً:

تھوڑا نہ کچھ بھی سینے میں ، طغیانِ اشک نے　　اپنی ہی فوج ، ہو گئی لشکر غنیم کا

ھور اس قدر ہیں ، ترے وحشیوں سے دشت　　گنتے ہیں شہریوں کو ، بیابانیوں میں ہم

اشیرِ بے قراریِ ناکام ! آفریں　　بے کام ، ان سے شوخ شمائل کو تھامنا

قیب کھائے قسم ، تو وفا کا آئے یقیں　　تو میری جان ہے ، کیا تیرا اعتبار مجھے ؛

ن مر گیا وہ چشم جو یاد آئی ، اور یار　　حیراں ہیں ، کہ مے تھی پیالے میں ، سم نہ تھا

کر ماں سے مے وشاہد ، رہے عزیز　　پیری میں موت یاد تھی ، پیری شباب میں

نظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں　　اتنا رہا ہوں دور ، کہ ہجراں کا غم نہیں

م وصال لینے سے ، ہوتا ہے مضطرب　　کیوں کر کہوں ؟ اسے مرے مرنے کا غم نہیں

ذبِ دل اسے کھینچ کے لائے تو کہاں لائے ؛　　جو غیر کا گھر ہے ، وہی مسکن ہے ہمارا

مر درازی ہے ، رقیبوں کو آرزو　　دیکھو زمانہ ہجر کے امیدوار ہیں

جوشِ یاس تو دیکھو ، کہ اپنے قتل کے وقت　　دعائے وصل نہ کی ، وقت تھا اثر کا سا

م کو ترجیح تم پہ ہے یعنی　　دل رُبا حسن و جاں رُبا ہے عشق

ے حشر ! جلد کر تہ و بالا جہان کو　　یوں کچھ نہ ہو ، امید تو ہے انقلاب میں

دکا کل میں بھی خود رفتگی اپنی نہ گئی　　جوشِ وحشت سے ، ہیں پابندِ سلاسل نہ ہوا

دوسری شکل یہ ہوتی ہے کہ منطقیانہ ترتیبِ مقدمات و تمہیدِ دلائل کے ذریعہ قولِ محال کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں۔ نتیجتاً اشعار میں ایک خاص قسم کی جمالیاتی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے ، مثلاً :

مت رکھیو گردِ تارکِ عشاق پر قدم　　پامال ہو نہ جائے سرافراز ، دیکھنا

ہوتا دامِ شکستہ سے بھی آسان نہیں　　میں گرفتارِ خمِ گیسوئے صیاد رہا

رد ہے ، جاں کے عوض ، ہر رگ و پے میں جاری　　چارہ گر ! ہم نہیں ہونے کے ، جو درماں ہو گا

ونے کے ہاتھ آیا ، کب بندِ قبا اس کا ؛　　ناخن جو نہ بڑھ جاتے ، تو عقدہ یہ وا ہوتا

ن سے پری وش کو نہ دیکھے کوئی ؛　　مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا

ینے پہ ہاتھ دھرتے ہی ، کچھ دم پہ بن گئی　　لو ، جان کا عذاب ہوا دل کو تھامنا

ل میں ناصح ! آئے کیا ؛ اپنا خیال　　جا سکے کب ؛ یار کے مسکن میں ہم

بے خود تھے، غش تھے، محو تھے، دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی تو، ہجراں سے کم نہ تھا

کبھی باہم متضاد یا متخالف اشیا کو سبب و مسبب یا علت و معلول کے رشتے میں پرو کر معانی و مفاہیم کی نئی جہتیں سامنے لاتے ہیں۔ مثلاً:

ڈوبا جو کوئی، آہ، کنارے پہ آ گیا
طغیانِ بحرِ عشق ہے، ساحل کے آس پاس

اعجاز سے زیادہ ہے، سحر ان کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں، جو لب سے بیاں نہ ہو

تاثیرِ سوزِ دل، کرۂ نار ہے مگر
اِس شعلہ رو کو، سینے سے میرے لگا دیا

جوشِ وحشت نے اٹھایا لاش کو
اپنے پاؤں ہی گئے مدفن میں ہم

مانگا کریں گے اب سے، دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو، دعا کے ساتھ

بیزار جان سے، جو نہ ہوتے، تو مانگتے
شاید شکایتوں پہ تری، مدعی سے ہم

کیا ایسے سے دعویٰ ہو، محشر میں؟ کہ جس نے تو
نظارۂ قاتل کو، احسانِ اجل جانا

مجلس میں مرے ذکر کے آتے ہی، اٹھے وہ
بدنامیِ عشاق کا اعزاز تو دیکھو

متذکرہ بالا سطور میں مومن کے جس رنگِ خاص کا ذکر کیا گیا ہے، اردو کے ناقدین عام طور پر اس سے واقف ہیں اور انھوں نے اپنے اپنے انداز سے اس کے افہام و تفہیم کی کوششیں بھی کی ہیں۔ لیکن طرزِ مومن کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ جس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں دی گئی۔ اس طرزِ خاص کا تعلق تجربات و محسوسات سے کم اور الفاظ کے ترتیبی استعمال سے زیادہ ہے۔ اس کی توضیح یوں کی جا سکتی ہے کہ اردو کے دوسرے شعرا کی طرح مومن کو بھی لفظی و معنوی رعایات و مناسبات سے بے پناہ دلچسپی ہے اور وہ ان کی مختلف شکلوں کو تا حدِ امکان ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ لیکن بطورِ خاص تناسب، ایہام تناسب اور تضاد و ایہام تضاد کی مختلف شکلوں کی بنیاد پر انھوں نے جس کثرت کے ساتھ بہترین اور دل آویز اشعار کہے ہیں، وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ان رعایات کے برتنے اور نباہنے کے سلسلے میں مومن اور دوسرے شعرا کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ مومن کے مدِ نظر یہاں بھی ذہنِ قاری کو حیرت و استعجاب اور مغالطے میں مبتلا کرنا ہے۔ جب کہ دوسرے شعرا اپنے اپنے مذاق کے مطابق بعض دوسرے مقاصد کے تحت ان کا استعمال کرتے ہیں۔ خط کشیدہ الفاظ پر نظر رکھتے ہوئے کلامِ مومن سے اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

آنکھ لگتے ہی ناصح! کچھ نظر نہیں آتا
گر یقیں نہیں حضرت! آپ بھی لگا دیکھیں

پکھ آنکھ بند ہوتے ہی آنکھیں سی کھل گئیں / جی اک بلائے جان تھا، اچھا ہوا، گیا

چینِ جبیں کو دیکھ کے، دل بستہ تر ہوا / کیسی کشودِ کار؟ کشادِ نقاب میں

آنکھ اس کی پھر گئی تھی، دل اپنا بھی پھر گیا / یہ اور انقلاب ہوا، انقلاب میں

آنکھ نہ لگنے سے، شب، احباب نے / آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا

جنت کی ہوس واعظ! بے جا ہے کہ عاشق ہوں / بالِ سیر میں دل لگتا، گر دل نہ لگا ہوتا

آزردۂ حرمانِ ملاقات سے ملے کیا؟ / یعنی کہ نہ ملنا ہی نہ ملنے کی سزا ہے

کون جیتا ہے؛ نگاہوں میں سبک ہونے کو / سخت جانی ہے، ترے دل پہ گراں ہونے تک

مارے خوشی کے مر گئے صبحِ شبِ فراق / کتنے سبک ہوئے ہیں؛ گراں جانیوں میں ہم

اس ضعف میں تو جینے سے آتا ہے لب تلک / کہتے ہیں اپنے نالے کو ہم نارسا، عبث

پانو تک پہنچی وہ زلفِ خم بہ خم / باندھیے اب سرو کو آزاد کیا!

اب تو مرجانا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو / ضعف کے باعث کہاں دنیا سے اٹھا جائے ہے؟

گو کہ ہم صفحۂ ہستی پہ تھے اک حرفِ غلط / لیک اٹھے بھی، تو اک نقش بٹھا کے اٹھے

جی ہی مانندِ نشانِ کفِ پا بیٹھ گیا / پانو کیا کوچے سے اس ہوش ربا کے اٹھے

ہجوِ ملیح غیر سمجھ کر مزے اٹھائے / خوش، حرفِ بے نمک سے بھی، ہم دل فگار ہیں

مومن عاشق طبیعت نوجواں ہی مر گیا / عشقِ طفلِ چند سالہ دشمنِ صد سالہ تھا

لو، چھیڑتے ہے نکہت کو، گلہائے شبنم کی / اب تم سے بھی چل نکلی، بادِ سحری اتنی؟

غالب کا مشہور شعر ہے ؎

اس نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی / سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اس شعر کا سارا حسن 'غیر' کے مدلول کی عدمِ تعیین کا نتیجہ ہے۔ متکلم غیر سے رقیب مراد لینا چاہتا ہے اور مخاطب خود عاشق کی ذات کو۔ اس صورتحال کو اصطلاح میں 'تفسیر القول بما لا یرضی بہ قائلہ' (یعنی متکلم کے منشا کے خلاف اس کے کلام کی تعبیر و تشریح) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ قول کی طرح عمل کی خلافِ منشا تعبیر و تشریح بھی ذیل میں آتی ہے۔ بہرحال کہنا یہ ہے کہ یہ اندازِ بیان اصلاً غالب کا نہیں بلکہ مومن کا ہے۔ اس لیے کہ غالب کی نسبت مومن کے یہاں اس کی متنوع مثالیں ملتی ہیں۔ دیکھیے:

وہ جو کہتے ہیں۔ تجھے آگ لگے ۔ — مژدۂ وصل سناتے ہیں مجھے

فرماتے ہیں۔ وصال ہے انجامِ کارِ عشق" — کیا ناصحِ شفیق نے مژدہ سنا دیا!

سمجھ کے اور ہی کچھ، مر چلا میں اے ناصح ! — کہا جو تو نے۔ نہیں جان جاکے آنے کی"

یارب کوئی معشوقہ دل جو نہ ملے اب۔ — جوان کی دعا ہے، وہی اپنی بھی دعا ہے

عشق نذرِ مزارِ ملک کے، اس پہ بھی — کہتے ہیں لوگ۔ خاک میں اس نے ملا دیا۔

شوخ۔ کہتا ہے بے حیا جانا — دیکھو، دشمن نے تم کو کیا جانا!؟

دونوں کا ایک حال ہے" یہ مدعا ہو کاش — وہ ہی خط اس نے بھیج دیا، کیوں جواب میں

بات شب کو، اس سے منع بے قراری پر بڑھی — ہم تو سمجھے اور کچھ، وہ اور کچھ سمجھائے تھا

اردو غزل گو شعرا میں مومن نے مذہبی تلازموں کے ذریعے جس قدر عمدہ اشعار کہے ہیں، ان کی مثالیں بھی دوسرے شعرا کے یہاں بہت کم ملتی ہیں۔ اس لیے ہم مومن کی اس قسم کی شاعری کو بھی ان کی طرزِ خاص کا ایک جزو سمجھتے ہیں۔ اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ہم بندگیِ بت سے، ہوتے نہ کبھی کافر — ہر جائے گر اے مومن! موجود خدا ہوتا

بے نامِ آرزو کا، تو دل کو نکال لیں — مومن نہ ہوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

اس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے — مومن: کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

وصلِ بتاں کے دن تو نہیں یہ، کہ ہو وبال — مومن! نماز قصر کریں کیوں؟ سفر میں ہم

واعظ کے ذکرِ مہرِ قیامت کو کیا کہوں — عالمِ شبِ وصال کے آنکھوں میں چھا گئے

جنبشِ نرگسِ جنت نے رلایا مومن! — چشمِ کافر کے اشارے میں نظر میں پھرتے

پھر دوریِ بتاں میں نہیں خواب کا خیال — مومن! مرے بھی دین میں سونا حرام ہے

واعظ بتوں کو خلد میں لے جائیں گے کہیں؟ — ہے وعدہ کافروں سے عذابِ الیم کا

منہ کو مومن سے چھپانا کافر! — یہ تقیہ تو نہ سکھایا مجھ کو

زندہ نہ ہوا ہائے، دلِ مردہ، اگرچہ — تھا شورِ قیامت سے فزوں ولولہ اپنا

غلط، کہ صانع کو ہو گوارا، خراشِ انگشت ہائے نازک — جوابِ خط کی امید رکھتے، جو قولِ جف القلم نہ ہوتا

کلامِ مومن کے تعلق سے اس بحث و تحقیق اور مختلف پہلوؤں سے اس کے تجزیہ و تحلیل کے بعد یہ بات

بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ مومن کی شاعری نہ تو ذوق کی طرح سادہ، سپاٹ، اکہری اور بے کیف ہے نہ وہاں جرأت کی چوما چاٹی ہے۔ نہ انشاء کی دھما چوکڑی ہے، نہ بعض لکھنوی شعراء کی رکاکت اور بے جان رعایت لفظی ہے، اور محض داغ کی محاورہ بندی، صفائی زبان ہے۔ بلکہ ان کی آواز میں ایک طرح کی سنجیدگی، رکھ رکھاؤ، وقار اور متانت ہے۔ ان کی معاملہ بندی میں بھی کھل کھیلنے کا انداز نہیں ملتا۔ پھر ان کے تجربات بھی یک گونہ تازگی و طرفگی لیے ہوئے ہیں اور طرز ادا میں بھی لفظی و معنوی تلازمات و انسلاکات کو ٹٹولنے اور برتنے کی توانائی اور قوت موجود ہے۔ لیکن دوسری طرف ان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ ایک خاص سطح سے اوپر کبھی نہیں جاتے۔ عاشق، محبوب اور رقیب ان کی شاعری کے مثلث کے تین اضلاع ہیں۔ یہ شاعری ہمیں الجھاتی ہے، مصروف رکھتی ہے اور بہ آسانی قابو میں نہیں آتی۔ لیکن ہما ہک، بالآخر یہ ہانپنے لگتی ہے اور اس کا سحر ٹوٹ جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں پہیلی اور معمے کی سی پیچیدگی اور الجھاو ضرور ہے، لیکن وہ تہ داری اور رمزیت نہیں ملتی جو عظیم شاعری کا خاصہ ہے۔ الحاصل مومن ایک قابل قدر قابل ذکر اور قابل مطالعہ شاعر ہیں لیکن صف اول کے شعراء میں ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

انتخاب مومن:

مومن کا اردو کلام سب سے پہلے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے ۱۲۴۳ھ / ۱۸۲۷ء میں مرتب کیا تھا۔ یہ دیوان بہ قول کلب علی خان فائق مطبع رفاہ عام دہلی سے ۳ صفر ۱۲۶۲ھ / ۳۱ جنوری ۱۸۴۶ء کو بہ اہتمام مولوی کریم الدین شائع ہوا۔ یہ مومن کا پہلا مطبوعہ دیوان ہے جو ان کی زندگی میں اشاعت پذیر ہوا۔ یہی نسخہ دوبارہ [illegible] میں بہ اہتمام منشی دیبی سہائے بھی شائع ہوا۔ اس کے بعد مومن کے شاگرد، خواہر زادہ اور بہ قول خود متبنیٰ عبدالرحمن آہی نے کلیات مومن کے نام سے ایک مجموعہ ترتیب دیا۔ اس کے مشتملات نسخۂ شیفتہ سے تعداد میں زیادہ اور ترتیب میں مختلف ہیں۔ اس لیے کہ بہ قول مرتب اس میں شیفتہ کی ترتیب دیوان کے بعد کا کلام، نیز مرتب کے پاس محفوظ کلام بھی شامل ہے۔ اس کی تقریظ منشی انور حسین تسلیم سہسوانی نے لکھی تھی۔ یہ کلیات پہلی بار مطبع نول کشور سے ۱۲۸۴ھ / ۱۸۶۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ بعد میں اس کے کم از کم چھ اور ایڈیشن منظر عام پر آئے۔ کلیات مومن کے مطبوعہ اور متداول نسخوں کی اغلاط کتابت و طباعت دیکھ کر پروفیسر ضیا احمد بدایونی نے ایک صحیح اور مستند دیوان مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ بیس قلمی اور مطبوعہ نسخوں کو سامنے رکھ کر ایک دیوان حرفاً ترتیب دیا۔ جو صحت و استناد متن اور عمدہ حواشی کے لحاظ سے دوسرے نسخوں پر یقیناً فوقیت رکھتا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت

۱۹۳۳ء میں الٰہ آباد سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک اس کے پانچ ایڈیشن اور چھپ چکے ہیں۔ ضیا صاحب کا مرتبہ دیوان مومن صرف حصۂ غزلیات پر حاوی تھا اس لیے کلب علی خاں فائق نے از سر نو کلیات مومن ترتیب دیا جو مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام دو جلدوں میں ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا ہے۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کی فرمائش پر ترتیب دادہ اس انتخاب مومن کی ترتیب متن کے سلسلے میں اصلاً استاذ ضیا احمد بدایونی کے دیوان مومن (طبع پنجم، ۱۹۷۰ء) اور کلب علی خاں فائق کے کلیات مومن (طبع اول ۱۹۶۴ء) پر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بوقت ضرورت درج ذیل نسخوں سے بھی مراجعت کی گئی ہے:

۱۔ کلیات مومن، مطبع نول کشور لکھنؤ، طبع ستمبر ۱۹۰۰ء

۲۔ " " طبع ششم ۱۹۳۰ء

۳۔ " " ضیا آرام پریس، کراچی، سنہ ندارد (مع مقدمہ از ڈاکٹر عبادت بریلوی ۱۹۵۵ء)

۴۔ قصائد مومن، مرتبہ ضیا احمد بدایونی، الناظر پریس ۱۹۲۵ء

مومن اصلاً غزل کے شاعر ہیں۔ اس لیے پیش نظر انتخاب میں سب سے زیادہ نمائندگی ان کی غزلوں کو دی گئی ہے لیکن ان کے قصائد، مثنویات، رباعیات اور مراثی وغیرہ سے یکسر صرف نظر کر لینا بھی مناسب نہ تھا اس لیے ان کے بہتر سے بہتر نمونے بھی شامل انتخاب کر لیے گئے ہیں۔

انتخاب کا لفظ لغت اور اصطلاح میں چننے، چھانٹنے اور پسندیدہ چیز کو الگ کر لینے کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ میں نے پیش نظر انتخاب میں لغت اور اصطلاح کی حد بندیوں کو برقرار رکھا ہے۔ بعض حضرات انتخاب کو نمائندگی کا مرادف سمجھتے ہوئے انتخاب میں صحیح و سقیم اور رطب و یابس دونوں کی نمائندگی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان حضرات کی رائے سے اتفاق دشوار ہے۔

ظفر احمد صدیقی

شعبۂ اردو
بنارس ہندو یونیورسٹی
وارانسی

دیوانِ مؤمن خان مؤمنؔ پر 4 مقدمے
پہلا مقدمہ از عبدالودود خان
دوسرا مقدمہ از ڈاکٹر سید عبداللہ
تیسرا مقدمہ از ظہیر احمد صدیقی
چوتھا مقدمہ از ظفر احمد صدیقی
مرتب: غلام مصطفیٰ دائمؔ اعوان